نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان کے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۶ فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۹ء شمار ۵

لاحظات ---------- ۲

تلامذۂ مصحفی ---------- مختار الدین آرزو ---------- ۹

بنگ کا ہولناک خراج نوع انسانی سے ---------- ۲۸

مثنوی زہر عشق پر ایک نظر ---------- خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے ---------- ۳۶

ادب اور اسکے مقاصد ---------- ل۔ احمد ---------- ۵۳

توبات نیاز ---------- ۶۰

یاض مرحوم کی اشعار عالیہ ---------- ۶۴

ب الاستفسار ---------- ۶۷

ظومات --- (نوابزادہ) راحت سعید خاں۔ تمکین۔ عدم۔ باقی۔ کیفی۔ بہار۔ کاوش۔ عرش۔ خیرات۔ امید۔ ۷۳

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۳۶	نومبر ۳۹ء	شمارہ ۵

ملاحظات

ارباب جامعہ ملیہ توجہ فرمائیں

ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں صرف ایک جامعہ ملیہ ہی ایسا ادارہ ہے جس کا ایک بہترین تربیت گاہ ہونے کی حیثیت سے میں بڑا احترام کرتا ہوں اور جس کی ترقیوں کا حال سن سنکر میں ہمیشہ خوش ہوتا ہوں، اس لئے اگر اتفاق سے کبھی کوئی ایسی بات میرے علم میں آئے، جو جامعہ ملیہ کی روایات اور میری توقعات کے خلاف ہو، تو قدرتاً مجھے تکلیف بھی اتنی ہی ہونا چاہئے

لازم ست احتمال چندیں درد
کہ محبت ہزار چندیں ست

میرے دل میں جامعہ ملیہ کی عزت کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ میرے نزدیک وہاں طلبہ کی ذہنیتوں کو قدامت پرستانہ جبر واکراہ سے تباہ نہیں کیا جاتا اور آزادی سے سوچنے کا موقعہ دیا جاتا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ وہاں کے اساتذہ کو میں صحیح معنے میں فرض شناس سمجھتا ہوں اور کبھی ان کی طرف سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ دی

وہ ذاتی خود غرضی پر قومی مفاد کو قربان کر سکتے ہیں۔ اس لئے میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب وہاں کے ٹرنینگ کالج کے ایک طالب علم کی ایک تحریر ان دونوں باتوں کی تردید میں میری نگاہ سے گزری۔ وہ تحریر یہ ہے:۔

"میں یہاں رہ کر جامعہ کی زندگی سے قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔ یہ امر واقعی قابلِ افسوس ہے کہ یہاں بھی قومی خدمت کے بہانے سے کچھ انتہا درجے کے خود غرض اور ناکارہ لوگ جمع ہو گئے ہیں اور بچوں میں ایک قسم کی (Narrow Nationalism) پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر مذہب وغیرہ کے متعلق بھی انھیں وہ تعلیم نہیں دی جاتی جو بیسویں صدی کے بچوں کو ملنی چاہئے۔ رمضان شروع ہونے سے پہلے نہ معلوم کس شخص نے بچوں کو روزہ رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ خدا ان ایام میں ساتویں آسمان سے اُتر کر پہلے آسمان پر آجاتا ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ انھیں بچوں کو میں دو چار دن قبل آسمان وغیرہ کی حقیقت سے باخبر کر چکا تھا۔ چنانچہ بچوں کے ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی اور جب ایک بچے سے نہ رہا گیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ڈائننگ ہال میں ایسے وقت جب ہم دونوں اکیلے تھے یہ سوال کیا کہ آسمان کے متعلق میں صحیح تھا یا وہ مولانا۔ بچہ ڈرا ہوا تھا، ادھر اُدھر دیکھتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ تو مجھے پس و پیش ہوا لیکن پھر میں نے حقیقت اور زیادہ صاف کر دی۔ ان معاملات میں یہاں میرا کیا فرض ہے، بتائیے؟

ٹرنینگ کالج کے اُستاد حد درجہ بیکار لوگ ہیں۔ ذرا محنت نہیں کرتے۔ لائبریری میں کتابیں موجود ہیں لیکن سبق دینے سے پہلے انھیں دیکھ کر آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کا ہر سبق ایک تماشا ہوتا ہے۔ سبق کا تشنہ رہنا تو کیا سبق کے دوران میں عدم واقفیت کے باعث اس قدر سخت غلطیاں کر جاتے ہیں کہ مجھے تو شرم آنے لگتی ہے۔ میرے ایک اُستاد پورے سولہ دن تک یہی پڑھاتے رہے کہ "تعلیم کا مقصد و مدعا ماحول سے 'تطابق' پیدا کرنا ہے"۔ دوسرے صاحب کھیل کے سلسلے میں ایک دن (Schiller Spencer) کا نظریہ پڑھا گئے۔ میں نے محض شرارتاً ان سے پوچھا "شلر اسپنسر" کون تھا؟ "نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی کی طرف کا تھا؟" اس پر میں نے ان سے پھر پوچھا کہ "کیا شلر اسپنسر" ایک نام ہے؟ "اس کے جواب میں وہ "ہاں" کہہ گئے۔ میں نے "شلر اسپنسر" کے متعلق پوچھا کہ وہ کس صدی میں تھا۔ اُستاد نے فرمایا "یہاں تاریخ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ جگہ میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ثابت ہو رہی ہے۔ روز یہ حساب لگایا کرتا ہوں کہ اتنے دن ان لوگوں کی شاگردی میں اور کاٹنے ہیں۔

مجھے اس تحریر کی صداقت میں مطلق شبہ نہیں کیونکہ اس کے لکھنے والے سے میں اچھی طرح واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ جامعۂ ملیہ کے مداحوں میں سے ہیں۔ اس لئے اب صرف یہ سوال سامنے رہ جاتا ہے کہ جامعۂ ملیہ کی

روایات کے خلاف کیوں اس قسم کی فرسودہ روایات سنا کر بچوں کے دماغ کو تاریک بنایا جاتا ہے اور کیوں ایسے اساتذہ رکھے جاتے ہیں جو جامعہ ملیہ کی خصوصیات کو قایم نہیں رکھ سکتے۔ یقیناً وہاں کا تمام اسٹاف ایسا نہیں ہوسکتا لیکن اگر دو چار اساتذہ بھی اس قسم کے پائے جاتے ہیں تو جامعہ ملیہ کو بدنام کرنے کے لئے کافی ہیں اور انھیں فوراً علحدہ کر دینا چاہئے۔

مغرب و مشرق کے دو نہایت اہم واقعات

اکتوبر کا مہینہ روئے زمین کے لئے بہت ہلچل کا زمانہ ثابت ہوا، اُس طرف مغرب میں ترکی و برطانیہ کے اتحاد نے جنگ کا نقشہ بدل دیا اور اِس طرف ویسرائے کے اعلان کے جواب میں کانگریسی صوبوں کی وزارتوں نے استعفے کا اعلان کرکے ہندوستان میں سخت بے چینی پیدا کر دی اور اگر ان دونوں باتوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اعلان ویسرائے کے بے نیازانہ انداز کا سبب غالباً یہی تھا کہ برطانوی حکومت جمہوریت ترکیہ کی حمایت حاصل ہوجانے کی وجہ سے جنگ کے نتیجہ کی طرف سے بہت مطمئن ہوگیا ہے۔

برطانیہ کی شرکت اس جنگ میں بظاہر بہت عجیب بات نظر آتی ہے، کیونکہ نہ اس کے ملک کے کسی حصہ پر جرمنی نے حملہ کیا ہے اور نہ وہ پولینڈ کی حمایت کرکے اپنے مقبوضات میں کوئی اضافہ کر سکے گا لیکن دنیا میں بہت سی لڑائیاں پیش بندی کے لئے بھی لڑی جاتی ہیں اور برطانیہ کی یہ جنگ اسی قسم کی جنگ ہے۔

برطانوی حکومت کا یہ دعویٰ کہ وہ صرف جمہوریت کی بقاء اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے تحفظ کے لئے جنگ کررہی ہے، غلط نہیں، لیکن یہ کہنا کہ اس کی غایت صرف اسی قدر ہے اور اس میں کوئی خود غرضی پنہاں نہیں، ناقابل قبول ہے۔

برطانوی حکومت کی پالیسی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی طرح ہندوستان سے تعلق نہ رکھتا ہو کیونکہ ہندوستان ہی تاج برطانیہ کا وہ درخشندہ گوہر ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی جدا کرنے کے لئے طیار نہیں۔

پھر اسوقت برطانیہ کے سامنے نہ سوال پولینڈ کی آزادی کا ہے نہ کسی اور جمہوریت کے بقا و تحفظ کا، بلکہ صرف اس بات کا کہ اگر نازی حکومت کی قوت اسی طرح بڑھتی رہی تو ایک طرف ریاستہائے بلقان اور مشرق ادنیٰ کے ممالک پر اس کا برا اثر پڑے گا اور دوسری طرف بحر روم میں برطانوی اقتدار ضعیف ہو جائے گا اور ان دونوں باتوں سے ہندوستان پر برطانوی گرفت کا کمزور ہوجانا یقینی ہے۔

روس کے حملۂ پولینڈ سے جنگ کی صورت بہت بری ہوگئی تھی اور یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ غالباً روسی فواج

نازی افواج کا ساتھ دیں گی، اسی کے ساتھ ترکی و روس کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی اس کا رجحان بھی برطانوی مفاد کے خلاف نظر آتا تھا اور اگر یہ دونوں اندیشے پورے ہو جاتے تو اس میں شک نہیں کہ برطانیہ و فرانس کے لئے مقابلہ بہت دشوار ہو جاتا اور ویسرائے کے اعلان کے الفاظ بھی کچھ اور ہوتے۔ لیکن اب کہ ترکی نے برطانیہ و فرانس کے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے اور روس بھی اس جنگ میں شریک ہونے کے لئے آمادہ معلوم نہیں ہوتا، برطانیہ کے حوصلے بہت بڑھا دئے ہیں اور ہٹلر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کرے۔ اٹلی پر اگر اسے کچھ بھروسہ تھا بھی تو ترکی برطانوی معاہدہ نے اسے بھی ختم کر دیا کیونکہ اب ریاستہائے بلقان سے تعلقات خوشگوار رکھنا اس کے لئے ضروری ہے اور یہ ہٹلر کا ساتھ دینے سے ممکن نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کی طیاریاں بڑے وسیع پیمانے پر جاری ہیں اور یقیناً ایک بار وہ جان پر کھیل کر نہایت سخت حملہ کرے گا، لیکن اس حملہ کی نوعیت کیا ہوگی، اس کا علم کسی کو حاصل نہیں، مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ سیگفرڈ لائن کی طرف وہ برطانوی و فرانسیسی فوج کے بڑے حصہ کو اُلجھا کر، کسی ایسے حصۂ ملک پر زبردست ہوائی حملہ کرے گا جس طرف اس کی طیاریاں بظاہر کم نظر آتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ملکی پیداوار کی کمی اور صنعتی تباہی کی وجہ سے ہٹلر عرصہ تک اس جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتا اور چونکہ سوائے روس کے کوئی ملک ایسا نہیں جہاں سے اس کو کھانے پینے کا سامان یا ذخیرۂ حرب پہونچ سکے اس لئے باہر سے بھی کسی مدد کی توقع اس کو نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس صورت میں اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ ایک بار وہ ہتھیلی پر سر رکھ کر قسمت آزمائی کرے، لیکن اس کا نتیجہ بھی اس کے موافق نہیں نکل سکتا۔ البتہ اگر روس نے ترکی و ریاستہائے بلقان پر حملہ کر دیا تو بیشک صورتِ حال بالکل بدل جائے گی۔

خیال تھا کہ موجودہ جنگ کے سلسلہ میں ہندوستان کے مستقبل کا مسئلہ بڑی حد تک طے پا جائیگا لیکن نتیجہ خلافِ امید نکلا۔ اس کا ایک خارجی سبب تو وہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا اور دوسرا داخلی سبب مسلم لیگ کی مخالفت ہے۔ اگر اسوقت مسلم لیگ بھی کانگرس کی ہمنوا ہو کر آزادیٔ ملک کا مطالبہ کرتی تو ویسرائے اقلیت و اکثریت کے جھگڑے سے فایدہ اُٹھا کر، ایسا خشک جواب نہ دے سکتے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس موقعہ سے فایدہ نہیں اُٹھایا اور جسوقت ہندوستان کی تاریخ آزادی مرتب کی جائے گی تو سب سے زیادہ شرمناک واقعہ اس میں یہی درج ہوگا۔ لیکن کانگرس کو بھی ہر الزام سے بری سمجھنا درست نہیں۔ اگر کانگرسی حکومتوں نے مصلحت اندیشی سے کام لیا ہوتا تو آج نہ مسلم لیگ کا وجود پایا جاتا اور نہ ہندو مسلم تفریق اس حد تک پہونچتی۔

مسلم لیگ یو۔پی ہی میں زندہ ہوئی اور یہیں مسٹر جناح نے اپنا کھویا ہوا وقار مسلمانوں میں حاصل کیا، لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ اگر کانگرس ذرا دانشمندی سے کام لیتی اور وزارت کے بعض افراد مہاسبھائی ذہنیت

سے کام نہ لیتے تو اسوقت ہندوستان میں نصف مسلمان سے زیادہ کانگرس میں شریک نظر آتے اور مسلم لیگ کا وجود کبھی کا محو ہو چکا ہوتا۔

سب سے پہلی غلطی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے کی کہ انھوں نے رابطۂ مسلم عوام کی تجویز کو معمولی چیز سمجھ کر پوری قوت سے نہیں چلایا اور انھوں نے خدا جانے کیوں یقین کر لیا کہ مسلمانوں کے ساتھ رابطہ بڑھا کر کانگرس کی طرف دعوت دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اول اول جب یوپی میں کانگرسی وزارت ہوئی تو ہوا کا رُخ یہ تھا کہ عام طور پر تمام مسلمان کانگرس کی طرف جھک پڑے تھے اور اگر کانگرسی جماعت ذرا رواداری و مسالمت سے کام لیکر اُن سے ربط و اتحاد بڑھانے کا پروپاگنڈا کرتی تو صورتِ حال اس وقت کچھ اور ہوتی، لیکن پنڈت نہرو نے اس مسئلہ کو التوا میں ڈالکر مسلمانوں کے جوش و خروش سے مطلق کوئی فایدہ نہ اُٹھایا۔ اس سے زیادہ کاری ضرب جس نے دونوں جماعتوں کے درمیان سخت افتراق پیدا کر دیا، اُردو ہندی کا مسئلہ تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوؤں کو ہندی پرچار کا حق حاصل نہیں ہے، لیکن وہ برسرِ حکومت ہونے کے بعد اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھنے کے بجائے اُن سے کھیلنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے کانگرسی مسلمان بھی بدظن ہو گئے اور مسلم لیگ کو کانگرس کے خلاف پروپگنڈا کرنے کا زبردست ذریعہ ہاتھ آگیا۔ بہر حال کانگرس سے غلطیاں ضرور ہوئیں، لیکن یہ غلطیاں ایسی نہ تھیں کہ مسلمان جوشِ انتقام میں ملک کے مفاد کو بھی نظرانداز کر دیتے اور ہندوستان کے مسئلۂ آزادی کو بھی پس پشت ڈالدیتے۔

اسوقت مسلمانوں کا پوزیشن یہ ہے کہ اگر وہ اپنی مخالفت سے کانگرس کے مقاصد آزادی کو نقصان پہونچا سکتے ہیں، تو اس کے لئے وہ برطانوی حکومت کی غلامی کو بھی ہمیشہ کے لئے قبول کر لینے کے لئے طیار ہیں اور یہ ذہنیت جیسی تنگ و تاریک ہے محتاج صراحت نہیں۔

ابھی تک تمام کانگرسی وزارتوں نے استعفا نہیں دیا، لیکن بہر حال ان کو اس خدمت سے سبکدوش ہونا پڑیگا اگر برطانوی پالیسی میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کانگرس کا پروگرام کیا ہوگا۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سوشلسٹ عنصر کو اس سلسلہ میں زیادہ اُبھرنے کا موقعہ ملیگا، اور گاندھی جی کی پیروی کرنے والی جماعت مشکل ہی سے امن و سکون کے ساتھ ستیاگرہ کو جاری رکھ سکے گی۔ اگر ایسا ہوا تو برطانیہ کی بین الاقوامی سیاسیات کو اس سے سخت نقصان پہونچے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس اندیشہ کے خیال سے وبسرائے کو پھر اکابر ملک سے گفتگو کرنے کی ضرورت لاحق ہو اور وہ کوئی ایسی صورت پیدا کرنے پر مجبور ہوں کہ ہندوستان میں بے چینی پیدا نہ ہونے پائے۔

سنی شیعہ نزاع

تحریک تبرا کے التوا کو کافی زمانہ ہو چکا ہے اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششیں کسی نہ کسی حد تک بار آور ثابت ہوں گی، لیکن اندرونی حالات کے علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ جھگڑا جس منزل سے شروع ہوا تھا، ابتک اسی جگہ قایم ہے اور اتنے دنوں کی سعی کوئی خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہ کر سکی

مولانا ابوالکلام نے دونوں فریقوں کے نمایندوں سے علحدہ علحدہ اور ایک ساتھ دونوں طرح گفتگو کی، لیکن کوئی صورت اسوقت تک ایسی پیدا نہیں ہو سکی جو اس نزاع کو تھوڑے ہی دنوں کے لئے ملتوی کر دیتی، ہمیشہ کے لئے ختم کرنا تو بڑی بات ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مدح صحابہ کا جلوس نکالنا یقیناً سنیوں کے مذہب کا ضروری جزو نہیں ہے اور بصورت امتناع اس کے وجوب کا حیلۂ شرعی اگر کوئی تھا بھی تو کمیونکے کے اجراء کے بعد اس کو اٹھ جانا چاہئے تھا۔

اور سنیوں کو اجراء کمیونکے کے بعد از خود اعلان کر دینا چاہئے تھا کہ اب وہ حضرات شیعہ کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے جلوس نہ نکالیں گے، لیکن افسوس ہے کہ بعض حضرات کی وجہ سے صلح و آشتی کی یہ فضا یہاں پیدا نہ ہو سکی اور گتھی پر گتھی پڑتی گئی، یہاں تک کہ اب اس کا سلجھانا سخت دشوار ہو گیا۔

لیکن اگر کسی طرح صورت یہ پیدا ہو جائے کہ سنی جلوس نہ نکالنے کا اعلان کر دیں تو پھر میری رائے میں شیعوں کو کمیونکے کی واپسی پر اصرار نہ کرنا چاہئے۔

خاکساری فتنہ

مشرقی کی اس تحریک کے متعلق جو خیال ہم نے قایم کیا تھا آخر کار وہی صحیح نکلا اور "علامہ" نے حکومت برطانیہ کی امداد کے لئے اپنے خاکساروں کی فوج پیش کر کے یہ راز کھول ہی دیا کہ "خدمت انسانیت" کا یہ دعویٰ حقیقتاً صرف "خدمت عیسائیت" کے لئے تھا۔ دنیا کی کوئی اجتماعی تنظیم ایسی نہیں ہے جسے برا سمجھا جائے، لیکن اس میں برائی پیدا ہوتی ہے اس مقصد سے جو اس تنظیم کے پیش نظر ہوتا ہے۔ اگر خاکساری تنظیم کا مقصود ملک و قوم کی خدمت ہوتا تو آج سارا ہندوستان اس کے ساتھ ہوتا، لیکن اب کہ اس نے اپنا نصب العین "غلامی" کی حمایت قرار دیا ہے، کوئی غیرتمند انسان اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے مشرقی تحریک جس قدر مضرت رساں ہے، اس کا حال پہلے ہی سب کو معلوم ہو چکا تھا، سیاسی زاویۂ نگاہ سے اس کے نقصانات کا علم اب لوگوں کو ہو گیا ہے، اسلئے

میں سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ کی عمر اب قریب ختم ہونے کے ہے اور اگر چند سانسیں اس کی ابھی اور باقی ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں بھی جلد ختم کردیں۔ لکھنؤ کی مسلم لیگ نے اپنے فرائض میں خاکساری حمایت کو بھی شامل کرلیا ہے اور چند دن قبل تو جوش وخروش کا وہ عالم تھا کہ ہندو مسلم نزاع کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا، لیکن چونکہ اس کا مقصود صرف کانگرسی حکومت کی مخالفت تھی، اس لئے یہ "بُغضِ معاویہ" بھی زیادہ دیر پا ثابت ہوتا نظر نہیں آتا۔

مسلم لیگی اخبارات کی تہذیب

جس وقت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کانگرسی وزارتیں استعفا دینے والی ہیں، اس وقت سے مسلم لیگی اخبارات نے جو اندازِ تحریر اختیار کیا ہے وہ اس قدر سخیف و ذلیل ہے کہ شاید ہی کسی قوم کی تاریخِ صحافت میں اتنا پست و ادنیٰ درجہ کا لٹریچر پایا جائے۔

یہ بدنصیب خوش ہیں کہ اب پھر برطانیہ کا دفتری اقتدار صوبوں میں قایم ہونے والا ہے اور اپنی اقلیت کی بزدلانہ داستانیں دُہرا دُہرا کر انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے ہیں، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں جس انقلاب کا تخم بویا جاچکا ہے، وہ اب کسی طرح فنا نہیں ہوسکتا اور آج نہیں تو کل اس کو ایک تناور درخت بننا ہے۔ ہندوستان کسی مخصوص قوم کا ملک نہیں ہے، لیکن اگر مسلمان اسے صرف ہندوؤں کی ملکیت سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو ملکی و قومی تحریکات آزادی سے علحدہ رکھنا چاہتے ہیں، تو بھی یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ان کے اخبارات ایسی ذہنیت کا ثبوت دیں جو گالی گلوج کرنے والی ادنیٰ درجہ کی جاہل و کمینہ قوموں میں پائی جاتی ہے۔

کانگرسی حکومتوں کی عارضی علحدگی کی امید پر، اُن کو عورتوں کے سے طعنے دینا، کانگرسی وزرا پر بازاری الفاظ میں حملہ کرنا، دامن پھیلا پھیلا کر ان کو عورتوں کے سے کوسنے دینا، ایسا ذلیل اوچھاپن ہے کہ کم از کم مسلمانوں کو تو ضرور اس سے احتراز کرنا چاہئے تھا جن کو " اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما" کی تعلیم دی گئی ہے۔

مہذب قوموں میں مخالفت و دشمنی کا بھی ایک مخصوص اخلاق ہوا کرتا ہے، لیکن مسلم لیگی اخبارات کی طرف سے جو دوستی کے آئین سے بھی واقف نہیں، یہ توقع کرنا کہ وہ دشمنی کی حالت میں سنجیدگی سے کام لیں گے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔

افسوس ہے کہ وہ دنیا کے حالات اور قدرت کے قوانین سے بالکل بے خبر ہیں، ورنہ وہ کبھی اس عارضی وجہ مسرت پر اپنی تنگ ظرفی کا ثبوت پیش نہ کرتے۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے ہوچکا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوؤں ہی کی سعی و کوشش سے یہ دولت اس ملک کو حاصل ہوگی، اسلئے اگر آج وہ کانگرسی صوبوں کی خود مختاری جاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں تو کل انھیں اسپر افسوس بھی کرنا پڑیگا لیکن یہ "کل" اسوقت آئے گا جب مسلمان اپنی تمام توقعات کو کھو چکے ہوں گے اور انکی "اقلیت" کا ڈر انھیں اس قدر بزدل بناچکا ہوگا کہ ہاتھ پاؤں کی قوت سلب ہوچکی ہوگی، دل و دماغ جواب دے چکے ہونگے اور ہندو جماعت انکے جسم و روح دونوں پر قابو پاکر ان کے گلے میں رسّی ڈالکر جدھر چاہے گی گھسیٹتی پھرے گی۔

"مسٹر جینا و شرکاءُہٗ" تو خیر اسوقت زندہ نہ ہوں گے، لیکن ان کی نسل کے افراد ضرور موجود ہوں گے اور وہ دیکھیں گے کہ ان کے آبا و اجداد نے جس غدارانہ ذہنیت سے کام لیا تھا، اس کا خمیازہ ان کی اولاد کو کس کس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے۔

تلامذۂ مصحفی

(مسلسل)

"ر"

(۳۶) رافت تخلص میاں رؤف احمد نام، یہ بہت غریب، مسکین، وحشی اور متلون المزاج قسم کے آدمی تھے، یہ پہلے مصحفی کے شاگرد ہوئے اور چند دنوں کے بعد جرأت کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے لگے، تذکروں میں ان کے دو شعر ملتے ہیں:-

دم وداع یہ کہنا ہے کیا غضب اس کا — کہ ہم تو جاتے ہیں رافت ترا خدا حافظ
جراح میرے زخم کو سینے کے تو سی مت — یہ جھانکنے کو دل کے جھروکا ہے بقیمۃ

(۳۷) رعنا تخلص، شیخ عبدالرحیم نام ولد شیخ عبدالکریم متوطن شاہجہاں آباد، ایک عرصہ تک لکھنؤ میں اقامت گزیں رہے:-

لاتا ہوں نقد جاں کو سو یہ واں نہیں قبول — نذر گدا بحضرتِ سلطاں نہیں قبول
ناصح جو ہم سے اُلجھے تو اُلجھے وہ ہمیں — ہونا کسی سے دست و گریباں نہیں قبول
زبس بجر غم رات تھا شور و شر پر — رہی آستیں صبح تک چشم تر پر
کیوں خال سیہ جاناں عارض پہ بناتے ہو — اس چاند سے مکھڑے کو کیوں داغ لگاتے ہو
سنتے ہو میاں رعنا کچھ ہوش گیا ہے کیا — وہ فتنۂ عالم ہے دل کس سے لگاتے ہو

(۳۸) رنگین تخلص، سعادت یار خاں نام، طہماسپ بیگ خاں تورانی کے لڑکے، سرہند میں پیدا ہوئے، یہ بہت اچھے شہسوار اور فنونِ سپہ گری سے خوب واقف تھے، اوائل عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور حاتم کے شاگرد ہوئے، میر صاحب کے پاس بھی شاگرد ہونے کو آئے تھے لیکن انھوں نے صاف صاف جواب دیدیا کہ تم امیر آدمی کے لڑکے ہو، تم کو شاعری نہیں آسکتی پھر حاتم کے پاس گئے اور انھیں سے ایک زمانہ تک اصلاح لیتے رہے، حاتم کے بعد وہ امان نثار کو اپنا

کلام دکھاتے رہے بعد کو انھوں نے مصحفی کو پورا دیوان دکھلایا جرمن مستشرق بلوم ہارٹ ایم۔ اے کی بھی یہی تحقیق ہے کہ وہ مصحفی کے شاگرد تھے مصحفی ان کے بارے میں تذکرہ ہندی[صفحہ ۱۰۱] میں لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں:- "ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد اما ذکاوت طبعش بر صاحب علماں غالب"۔ رنگین نے اپنا دیوان اصلاح کے لئے پیش کیا شروع سے آخر تک دیکھ کر فرمایا:- "کلامش بسیار کم اصلاح بر آمدہ" اصل رائے یہ ہے:- "چوں مزاجش عشق باز افتادہ اکثر قطعہ ہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلک نظم کشیدہ"۔

ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب یہ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے، مگر شیفتہ اور گارساں دتاسی ان کی عمر اکاسی (۸۱) اور سال وفات ۱۲۵۰ھ بتلاتے ہیں، تصانیف میں "مثنوی دلپذیر" "ایجاد رنگیں" "مظہر العجائب" کافی مشہور ہیں ان کے چار دیوان بھی ہیں دیوان ریختہ، دیوان بیختہ، دیوان آمیختہ، دیوان انگیختہ، رامپور اسٹیٹ لائبریری میں رنگین کا ایک مصور بیاض پایا جاتا ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے پری پیکر محبوب اشاق معدن المعانی، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

جی بیچ کے یہ عشق کا جنجال خریدا　　اس جنس کو کھو ہم نے عجب مال خریدا
ایسے ظالم کو دل دیا ہم نے،　　آہ اللہ، کیا کیا ہم نے
دل ہو خوں اور حنا کو بھاگ لگے　　اس تری منصفی کو آگ لگے،
شب کو جو آپ اُٹھ گئے، نیند مری اُچٹ گئی　　تارے ہی گنتے گنتے پھر رات وہ ساری کٹ گئی

"ز"

(۳۹) زلال تخلص، میر دوست علی نام ولد میر محمد پناہ ساکن اٹاوہ، یہ پہلے دوست تخلص کرتے تھے اور مصحفی کے خاص شاگرد محمد عیسیٰ تنہا سے اصلاح لیا کرتے تھے اُن کی رحلت کے بعد مصحفی کی طرف رجوع ہوئے، فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے بعد کو انھوں نے اپنا تخلص بدل کر زلال رکھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

نازم بزلف یار کہ در یک نظارۂ　　زنار کفر در کمر پارسا بہ بست
اک چشم کی گردش سے دو عالم کو کیا مست　　کس بارہ سے تھے وہ نگہ ہوش ربا مست
ڈھکو تو ہاتھ سے کیفیت شب مہتاب　　نقاب چہرۂ زیبا سے ماہرو نہ اُٹھا
سر نہیں ہے جو رہ عشق میں برباد نہ ہو　　دل کہیں لگے نہ اسے جس میں تری یاد نہ ہو
ٹھیر اے دست جنوں موسم گل آنے دے　　تو ابھی سے تو گریباں کو مرے[لہ] آنے دے

لہ اس شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا گل کا قافیہ "مرے" بھی عجیب ہے۔　　(مختار الدین)

(۴۰) زیبا تخلص، عبدالرحیم ولد خواجہ محمد تقی متوطن شاہجہاں آباد، ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے، اور پشمینہ کی تجارت کیا کرتے تھے، ان کے بارے میں مصحفی کی رائے سنئے لکھتے ہیں :۔ "باوصف کم علمی طبع رسا و ذہن ذکا دارد"[1]

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

فراغت کر چکا مانی جب اسکے طاقِ ابرو سے
کفک کا اس کے نقشہ کھینچ دیجو میر لوہوے

مردمانِ چشم سے یہ چشم تر خالی ہوئے
اب تو آ ظالم کہیں یہ دونوں گھر خالی ہوئے

پھر آپ نے غیروں سے ملاقات نکالی
اچھا یہ نئی چھیڑ مرے ساتھ نکالی

مول لو آئینۂ دل کو کہ ارزاں چیز ہے
مفت سمجھو اس کو خوباں دست گرداں چیز ہے

پہلے تو ہم کو مارا صورت دکھا دکھا کر
آخر کو لے گئے دل میرا لبھا لبھا کر

کچھ کھاکے مر رہیں گے ہم تو جو یوں ہی پیارے
راتوں کو تم پھروگے مسّی لگا لگا کر

دے بوسہ گر اس طفل پریزاد کے منھ پر
تو رنگ کچھ آوے دل ناشاد کے منھ پر

"س"

(۴۱) ساماں تخلص، خواجہ محمد حسین نام خلف خواجہ ترس، شاہجہاں آباد کے رہنے والے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ۱۰ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا، کچھ دنوں کے بعد دریافت حسن و قبح کے لئے مصحفی کے پاس آئے انھیں دکھایا اور پھر شاگرد ہوئے مصحفی لکھتے ہیں :۔ "در طبعش لطافتے یافتم۔۔۔۔ گرہمیں و تیرہ چندے مداومت کرد بجائے خواہد رسید"۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

منھ نمک سے بھر دو میرے زخم کے ناسور کا
کون احساں سر پہ لیوے مرہم کافور کا

ہم کو مشکل ہی رہا ہجر میں نالاں ہونا
زخم دل سیکھ گیا یار سے خنداں ہونا

نوکِ مژگاں تک مرا لختِ جگر گر آئے گا
رشک سے ابر بہاری خون ہی برسائے گا

الٰہی تشنہ لب تھی روح کس رند شرابی کی
مئے گلگوں کا ساغر دست گلگوں میں چھلکتا تھا

---

(۴۲) ساحر تخلص فضل حق نام عرف غلام مینا ولد شیخ فضل امام متوطن کاکوری، پہلے یہ نثر نویسی کی طرف مائل تھے مصحفی نے انھیں فارسی اشعار کہنے کی طرف متوجہ کیا، وہ متوجہ ہوئے اور مصحفی سے اصلاح لینے لگے ان کی تعریف میں مصحفی کی چند سطریں بڑی قیمتی ہیں فرماتے ہیں :۔ "بطور شیخ علی حزیں علیہ الرحمہ دریں بیاباں دشوار گزار پا می گزارد و مورد تحسین و آفرین می شود اگر زمانہ فرصت دار دو دریں کوچۂ تنگ و تار کہ ہر نا اہل را قدم گزاشتن بسیار دشوار است یکے از بے نظیران روزگار خواہد شد"۔

---

[1] یہ مصحفی مرحوم کی رائے ہے، حالانکہ میرا خیال ہے کہ ان کی غزل بھر میں مشکل سے ایک شعر بھی اچھا مل سکے، ان کے کلام میں فن کی غلطیاں، بیان کا الجھاؤ کافی پایا جاتا ہے ابتذال اور رکاکت ان کے اشعار کا خاصہ ہے۔ (مختار الدین)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

زبس شرار غم از استخوان من برخاست　　چو شعلہا کہ پس از مرگ از کفن برخاست
بہ نسبے کہ چو ساحر زدیم نالۂ گرم　　شرر ز مغز دل مرغ نغمہ زن برخاست
نمی یابم دریں محفل حریف ہمزبان خود　　برنگ شمع خود گریم بسوزد داستانِ خود
دراں وادی کہ گم شد ہر قدم صد خضر رہ پیما　　کجا جویم نشانِ نقش پا از کاروانِ خود
چہ نالہ در قفس اے مرغ گلستاں زدۂ　　کہ پہلوئے من خونیں جگر ستاں زدۂ

---

(۴۳) پسند تخلص میرزا لطیف بیگ ولد مرزا دائم بیگ ابن منعم بیگ، میاں شمیم کی معرفت مصحفی کے یہاں آئے اور شاگرد ہوئے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

میں اسیر غم کہاں اور کوچۂ قاتل کہاں　　یہ نہیں معلوم جاکر دل ہوا گھائل کہاں
بنتے تھے ترے ہاتھوں سے تھے نالاں کتنے　　دل دیا ہم نے تجھے ہم بھی تھے ناداں کتنے
مریض عشق ہے جو اس کو کیا شفا ہوئے　　الٰہی کوئی کسی کا نہ مبتلا ہووے
جاں لبوں پر ہے، دم شماری ہے　　آج کی رات ہم پہ بھاری ہے
حرف شکوہ کا لب پہ لا نہ پسند　　کام عاشق کا جاں نثاری ہے

---

(۴۴) سخنور تخلص، مولوی احمد علی نام، لکھنؤ کے رہنے والے، مرشد آباد میں قیام پذیر تھے، تفصیلی حالت باوجود تلاش وتفحص کے معلوم نہ ہوسکا، صاحب "سخن شعرا" نے ان کے صرف تین شعر دئے ہیں وہ حاضر ہیں:-

آپ گو ہے سخن غیر میں لیکن صاحب　　کان میں گرتے ہی کر دیتا ہے بہرا پانی
لب شکر شکن اس غیرتِ گل کا دکھانا ہے　　چمن میں طوطی و بلبل کو آپس میں لڑانا ہے
اثبات جزو لایتجزیٰ میں تھا کلام　　ساکت رہا وہ غنچہ دہن انفصال ہے

---

(۴۵) سرسبز تخلص، مرزا زین العابدین نام، قوم کے پٹھان، کتب دینی کا مطالعہ بہت کیا کرتے تھے، اور غنا وغیرہ سے مجتنب رہا کرتے تھے، انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا، یہاں تک کہ ۱۰ سال کی عمر میں دیوان مرتب کر چکے تھے، مصحفی چار برس تک بہ سلسلۂ ملازمت در رفاقت ان کے یہاں رہے تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

قفس میں گزرے گی کیا عندلیب خانہ ویراں پر　　سنے گی جس گھڑی ہے ان دنوں عالم گلستاں پر

اس کے کوچہ کی طرف میں تو نہ جاؤں سر بسر
کشش دل ہی کہ کھینچے لئے جاتی ہے مجھے

شب انتظار گزری ہمیں انتظار کرتے
کبھی دوست دوست کرتے کبھی یار یار کرتے

یہ جو کانوں میں بتاں عقد گہر رکھتے ہیں
میرے آنسو ہیں کہ یکجا انھیں کر رکھتے ہیں

"ش"

(۶۴) شاد تخلص نام الہ یار بیگ، یہ کیانی نسب کے تھے، مصحفی کے شاگرد تھے، گلشن بیخار نے صرف دو شعر انکے لکھے ہیں:-

اگر چاک سینہ کا ہم وا کریں
تو ہنگامۂ حشر برپا کریں،

گلعذاروں کی بے وفائی کا
داغ دل پر مری نشانی ہے،

(۷۴) شاد آب تخلص، خوش وقت رائے نام چاند پور کے رہنے والے، مصحفی کے علاوہ قایم سے بھی اصلاحیں لی تھیں۔

جب تلک ہو کام مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا
تیر کے ہوتے کوئی کھینچے بھی ہے تلوار کو

(۸۴) شاد تخلص، فضل علی نام، مصحفی کے شاگرد تھے اور بقول صاحب سراپا سخن[۲۶۶] و صاحب سخن شعرا[۲۳۶] صاحب دیوان تھے چند اشعار سنئے :-

بنا ہے برق وش دونوں کا کیا دل،
مرا بے چین تیرا چلبلا دل،

نہیں سنتا کبھی وہ درد دل کا،
عجب بے درد کے پالے پڑا دل

عجب کمبخت وہ ساعت تھی اے شاد
لگا تھا جس گھڑی اس سے مرا دل

(۹۴) شائق تخلص، لالہ سیوا رام نام، شروع میں جو کچھ یہ موزوں کرتے میرزا علی نظیر کو دکھاتے رہے جب اس فن میں کچھ طاق ہوئے تو مصحفی سے مشورۂ سخن کرنے لگے، کچھ دنوں کے بعد خواجہ حیدر علی آتش کے پاس گئے اور انھیں کو اپنا کلام دکھانے لگے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

اس کی نورانی جبیں پر داغ چیچک کے نہیں،
موتیا کے پھول پھولے ہیں شب مہتاب میں

در بدر ہم ٹھوکریں کھاتے نہ رسوائی کے ساتھ
دوستی کرتے نہ گر اس طفل ہرجائی کے ساتھ

وقار انساں کا کھو دیتا ہے آخر خندۂ بیجا،
دہن ہونا کشادہ عیب ہے موتی کے دانے کا

سبزئی عالم مرے اشکوں کی طغیانی سے ہے
زندگانی ساری مخلوقات کی پانی سے ہے

(۵۰) شعور تخلص، عبدالرؤف نام ولد شیخ حسن رضا عرف بستی میاں، اصلی وطن بلگرام تھا لیکن یہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، مصحفی لکھتے ہیں :- "ذہنے رسا و طبعے تمیزہ دار داگر چندے مشق نمود دریں فن از بے نظیرگان روزگار خواہد شد"۔ صاحب دیوان تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

حق تعالیٰ نے تجھے رشکِ قمر پیدا کیا	کم تر اس انداز کا کوئی بشر پیدا کیا
جو شانہ گیسوئے جاناں میں ہم کبھو کرتے	تو تیری اے دل گم گشتہ جستجو کرتے
سیاہ بختِ ازل ہوں کہاں یہ میرے نصیب	کہ قتل کر کے مجھے آپ سرخرو کرتے
اس واسطے کہ گل کو دکھاوے بہارِ گل	آئینہ آب جو نے رکھا ہے دو چار گل
نقاب چہرے سے گر اُٹھا دے یقین مہ چاردہ کا ہووے	جو زلف بکھرائے اپنے رخ پر خیال ہو خلق کو گہن کا
مزا اُٹھایا یہ خار صحرا کا میرے پاؤں کے آبلوں نے	خیال آیا نہ خواب میں بھی دلِ حزیں کو کبھی وطن کا

---

(۵۱) شفق تخلص، میاں بندہ علی نام، انھوں نے اپنی چند غزلیں مصحفی کو دکھلائی تھیں، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

اس لاغری پہ رنج دہ دوستاں ہوں میں	ہر چند ہوں سبک پہ دلوں پر گراں ہوں میں
اے اضطرابِ دل نہ تصدق چمن کا کر	رہنے دے مجھ کو باغ میں بے آشیاں ہوں میں

---

(۵۲) شکیب تخلص، نواب اصغر علی خاں نام خلف الصدق نواب عنایت علی خاں، ابتدا میں کسی کو نہیں دکھاتے تھے آخر میں مصحفی کو اپنی غزلیں دکھانی شروع کیں، مصحفی لکھتے ہیں :- "فکرش بلیغ است و ذہنش رسا"، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

آب داری اسکو کہتے ہیں زہے انداز قتل	مانگتا پانی نہیں کشتہ تری شمشیر کا[1]
عجب طرح کی کشاکش تھی مہ جبینوں میں	گیا جو آئینہ اک روز ان حسینوں میں
بہار لالہ دکھاؤں گا باغباں تجھ کو	بھرے ہیں لختِ جگر میں نے آستینوں میں
دامِ اُلفت میں پھنسے ہیں اب تو اے صیاد ہم	دیکھئے اس دام سے ہوتے ہیں کب آزاد ہم
بزمِ عشرت ہم نے جانا قیدِ زنداں کو شکیب	نالۂ زنجیر کو سمجھے مبارک باد ہم

---

(۵۳) شمیم تخلص، شیخ محمد صابر نام ولد شیخ عبداللہ مصحفی کے شاگرد تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :-

دل مرا جس بت پُرفن کا طلبگار رہا	اس کی صورت سے مری زیست تک انکار رہا

---

[1] اس شعر سے کچھ ملتا جلتا ایک شعر راقم کا بھی ہے :-	جس کا دل سوزِ غمِ پنہاں سے پھنکتا ہو صدا	پھر وہ پانی مرتے دم تک مانگ کر پیتا نہیں
(مختار الدین)

مت کھولنا تو کاکل پیچیدہ دیکھنا ظالم نہ کھل پڑے دل شوریدہ دیکھنا
ملی نہ دیدۂ خونبار سے ذرا فرصت نت آستیں کو رہے ہم تو شست و شو کرتے
بھنور سے نکلی کہ طوفاں سے پھر دوچار ہوئی ہماری کشتی نہ ساحل سے ہمکنار ہوئی

---

(۵۴) شگفتہ تخلص، مرزا امیعت علی خاں نام خلف نواب شجاع الدولہ، پہلے یہ بیان تخلص کرتے تھے۔ انھیں فن شاعری کے علاوہ فن موسیقی، تیراندازی، شناوری، تصویرکشی میں بھی کافی دخل تھا، کشتی چلانی بھی جانتے تھے، خط نسخ بہترین لکھتے تھے ایام طفولیت ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا، اک ضخیم دیوان مرتب کیا لیکن عجب اتفاق کہ ان کے گھر میں آگ لگ گئی جس میں اثاث البیت کے علاوہ اُن کا وہ قلمی دیوان بھی نذر آتش ہوگیا، اس کا انھیں بیحد صدمہ ہوا یہاں تک شعر و شاعری قطعاً ترک کردیا، لیکن سچ ہے ع "مرہم ساعت سے بھر جاتا ہے زخم"۔ کچھ دنوں کے بعد پھر دوسرا دیوان مرتب کردیا، مصحفی کی رائے ان کے متعلق یہ ہے :۔ "فکر سخن بعمدگی وصفائی تمام می کند و قصیدہ ہائے آبدار در سلک نظم کشیدہ اند،...... ریختہ گفتن مناسب حال است از فصاحت و بلاغت و معنی بندی و سادہ گوئی، و امثال زنانہ و مردانہ نظیر خود ندارند"۔ میری رائے ان کے اشعار کے متعلق یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت تو انھیں چھو بھی نہیں گئی ہے اور معنی بندی تو غریب کے کلام میں عنقا کی طرح غائب ہے، ان کے اشعار کے ورق کے ورق پڑھ جایئے، شاید آپ کو شعر بھی پسند نہ آئے گا، نمونہ کلام ملاحظہ ہو :۔

کل ترے بیمار کی کچھ تھی طبیعت انمنی آج جو دیکھا تو منہ پر پھر گئی ہے مردنی

اک دلچسپ شعر سنئے :۔

اس قدر مرغوب خاطر ہے مرا وہ نوجواں دوڑتی ہے جس کے چہرہ سے بدن پر سنسنی

دو فصیح و بلیغ شعر سنئے، غیر ممکن ہے کہ آپ داد نہ دیں، لکھتے ہیں :۔

کب کسی پر غیر دل اس کا نکل جانا کھلا شب گیا یوں منہ پہ دامن کی لگا گلدامنی
اے شگفتہ تم سے جب رکھے دریغ اک فلس داغ کیونکہ کچھ دیتا کسی کو ہوگا یہ چرخ دنی،

اسی پر بس نہیں ہے، بیان کے اُلجھاؤ، تعقید کی بھرمار اور ابتذال کا اگر شاہکار دیکھنا چاہتے ہوں تو یہ اشعار سُنئے :۔

ہر کسی کی نہیں طاقت جو قدم مار سکے وادیِ عشق سے قاصد کوئی پر لا گذرا
نہ سونگھا سگ نے نے تھو کا ہما نے جلی سی بسکہ سوئے استخواں تھی،
صاف کاجل کی کوٹھری ہے جہاں سرمہ اتنا دیا نہ کر گہرا
دن کو تو خیر چاہا جہاں تم وہاں رہے جب رات کو کہیں رہے پھر ہم کہاں رہے
گالی گلوچ مار کٹائی نہ ہو سو کیوں جب اس کا ہاتھ اور نہ میری زباں رہے

(۵۵) شوق تخلص، میرزا جوہر[1] نام ولد میرزا وارث علی، انھیں فن لغز و معما سے بھی واقفیت تھی، آخر عمر میں مشہد مقدس چلے گئے، ان کی زبان میں لکنت بہت تھی یہی وجہ ہے کہ یہ مشاعروں میں شعر پڑھنے سے معذور تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

فائدہ کیا جو لئے جاتی ہے بستاں کی طرف　　لے چل اے وحشتِ دل مجھکو بیاباں کی طرف

تجھ بن قلق سے بسترِ غم پر تمام رات　　تڑپا کیا مرا دلِ مضطر تمام رات

حاصل یہ عشق میں نہیں جاہ و حشم ہوا　　آنسو تو فوجِ غم ہوئے نالہ علم ہوا

ہمارا حال زار اے شوق وہ اگر دیکھے　　یہ کیا ممکن ہے جو آنسو نہ چشمِ یار سے ٹپکے

---

(۵۶) شہیدی تخلص، منشی کرامت علی نام ولد عبدالرسول خاں عروضی باشندہ لکھنؤ مقیم بریلی، مصحفی کے علاوہ انھوں نے نصیر دہلوی سے بھی اصلاحیں لی تھیں، پیشتر پنجاب و گجرات و رامپور، بریلی، بھوپال، دہلی میں رہتے تھے، یہ بیان نساخ کا ہے لیکن صاحب سراپا سخن نے بریلی کی اقامت کے متعلق صرف لکھا ہے، علم عروض و حساب میں امثال و اقران سے زیادہ دخل رکھتے تھے بڑے بے تکلف اور عاشق مزاج تھے، آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے ۱۲۵۵ھ میں سفر حجاز کیا اور بعد ادائے حج بیت اللہ روانہ مدینۂ منورہ ہو کر اثنائے راہ میں بیمار ہو گئے، چہارم ماہ صفر المظفر ۱۲۵۶ھ میں مدینہ پہونچے روضۂ مبارکۂ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھکر روح جوشِ اشتیاق سے قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، صاحب دیوان تھے اور نساخ لکھتے ہیں کہ اشعار ان کے خوب ہوتے ہیں، دیوان ان کا نظر سے گزرا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کیا ملاحت رخِ جاناں میں ہے اللہ اللہ　　آ گیا جس کے تصور سے مزا آنکھوں میں

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح　　وہ اسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

نئی باتیں نئی گھاتیں نئی چاہت نیا پیار　　کیا قیامت ہے نئے شخص پہ آنا دل کا

شرم آتی ہے وگرنہ ان بتوں کے ضد سے میں　　جیتے جی اللہ سے اک حورِ جنت مانگتا،

ناکامی جاوید کی ہم مانتے منت　　افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

ایک غیر فانی شعر سنئے:-

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے　　دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

مجھے ان کا یہ شعر بہت بھاتا ہے:-

مجھے عذابِ جہنم کہ بت پرست ہوں میں　　وہ بت بہشت میں دعویٰ جسے خدائی کا

---

[1] ان کا نام مصحفی نے ریاض الفصحا میں میرزا جوہر لکھا ہے لیکن شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشن بیخار ص ۵۵ قلمی میں جوہر بیگ نام بتایا ہے، میں مصحفی کے بیان کو اس بارہ میں زیادہ صحیح سمجھتا ہوں اس لئے کہ ایک استاد کو اپنے شاگرد کے نام سے بہ نسبت دوسرے کے زیادہ واقفیت ہوتی ہے۔ (مختار الدین)

یہ فارسی میں بھی اشعار کہتے تھے، ان کا صرف ایک فارسی شعر مل سکا:-

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت　　　مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

"ص"

(۵۷) صبا تخلص، لالہ کانجی مل نام قوم کایستھ سکسینہ، بزرگوں کا وطن فیروز آباد تھا خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں پرورش پائی، مصحفی شروع میں انھیں کے مکان پر اقامت گزیں ہوئے تھے اسی زمانہ میں انھیں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی سا مشفق اُستاد موجود تھا انھیں سے کسب سخن کرنے لگے، اسی کا نتیجہ ہے کہ تھوڑی مدت میں ایک مختصر دیوان مرتب کر لیا، مصحفی ان کے متعلق اپنی رائے دیتے ہیں:-

"طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش وفا میکرد زیادہ ازیں قدم بر جادۂ ترقی می نہاد"

صہ۱۹۶

عین جوانی میں پچیس برس کی عمر میں مدقوق ہوئے اور انتقال کر گئے۔ قدرت اللہ قادری نے اپنے تذکرہ تذکرۃ الشعرا قلمی میں لکھا ہے کہ دیار شرقیہ میں کہیں مرے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

عبث ہے یہ تمھارا پاس میرے بار بار آنا　　　جدائی میں مجھے مشکل ہے اے یار و قرار آنا

نہیں معلوم اے یار و صبا کے دل میں کیا آیا　　　ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اُٹھا

مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اس قاتل کے کوچہ میں　　　لئے جاتا ہے نامہ آج تو اے نامہ بر کس کا

کیا تو نے کچھ صبا سے اے تند خو کہا تھا　　　روتا ہوا ادھر سے با چشم تر گیا ہے

اس خاکداں سے جھاڑ کے دامن کو جوں صبا　　　ایسا گیا کہ پھر نہ سراغ صبا ملا

---

(۵۸) صفا تخلص، لالہ منو لال نام لکھنؤ کے رہنے والے قوم کایستھ سے تھے، ولد رائے پورن چند اخبار نویس بعض صاحبوں نے انھیں میر تقی میر کا شاگرد لکھا ہے اور بعض تذکرہ نویس مصحفی کا شاگرد بتلاتے ہیں صاحب دیوان گزرے ہیں ایک فارسی گو شاعر بہجت کے قلمی دیوان میں ان کی ترتیب دیوان کا قطعہ تاریخ نظر سے گزرا۔

صاحب تذکرہ گلشن بیخار نے صرف یہ ایک شعر نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا صرف ایک شعر ملا:-

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　　کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں[1]

لیکن میری نظر سے ان کے تین شعر اور گزرے ہیں ملاحظہ ہوں:-

خوبصورت جو بہت حور کو سمجھا ہے صفا　　　تو نے دیکھا نہیں اس رشک پری کا منھ کیا

---

[1] اس شعر کو بعض صاحب تذکرہ نے حسرت کے نام سے بھی لکھا ہے۔

مرے منھ میں تو اسکے نام سے پانی بھر آتا ہے
مزا ایسا ہے کیا اس بوسۂ چاہِ زنخداں میں

مرے رونے سے دل اُسکا تو کچھ مائل بہ رقت ہو
مرے حق میں مرا رونا تو یہ باران رحمت ہے

"ض"

(۵۹) ضمیر تخلص، میر مظفر حسین نام خلف قادر حسین خاں، مرثیہ گو نامی، لکھنؤ کے رہنے والے تھے، صاحب دیوان تھے مرثیہ کی طرف انھیں خاص رجحان تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ غزل نہیں کہتے تھے، غزلیں بھی کہتے تھے۔ چند شعر سنئے:۔

کیا کہوں میں کہ اب کہاں ہے دل،
اس گلی میں رواں دواں ہے دل

گاہ پہلو میں گاہ یار کے پاس
دیکھیو تو کہاں کہاں ہے دل

پوچھو تو ضمیر جگر افگار کہاں ہے
جس دن سے گیا وہ نہ پھر اس کی خبر آئی

حالت مری حبیب، اس کو دگرگوں نظر آئی،
اوروں کو تو کیا چشم مسیحا کی بھر آئی

صد حیف ضمیر ہم تو روئیں،
اس کی کبھی چشم تر نہ ہوئے

"ط"

(۶۰) طپاں تخلص، میرزا رمضان علی بیگ نام ولد میرزا رجب علی بیگ قوم مغل ساکن قصبۂ آسیون من مضافات صوبہ اودھ ۱۲۲۸ھ میں تلاش معاش کے لئے وطن سے وارد لکھنؤ ہوئے، استعداد اچھی رکھتے تھے، فارسی و اردو اشعار کے علاوہ نثر نویسی میں بھی کچھ کم نہ تھے مشاعرہ میں ان کے کلام سے ایک رونق پیدا ہو جاتی تھی، نمونہ کلام ملاحظہ ہو

بے زبانم بہ سوائے لب خود وا نہ کنم
جاں بحسرت دہم و عرض تمنا نہ کنم

بر باد شد ز دست فلک آں ہم اے طپاں
در کوئش از مزار نشانے کہ داشتم

بردل بہ کنیم جبر تا چند "
اے وعدۂ خلاف صبر تا چند

ہم آزما چکے ہیں بہت گرم و سرد عشق
دیجے اسے فریب جو نا کردہ کار ہو

سیکھ ہم سے طریق رونے کا
دیکھ اے ابر یوں برستے ہیں

مری حالت سے کاشکے ہوں آگاہ
میرے رونے پہ جو کہ ہنستے ہیں

دل پتنگے کا جلا شب دیکھ جانسوزی مری
رات بھر روتی رہی سن کر مرا افسانہ شمع

"ظ"

(۶۱) ظریف تخلص، لالہ بینی پرشاد نام ولد روشن لال برادر خورد لالہ چینی لال حریف (تلمیذ مصحفی) ۱۴ سال کی عمر میں

شعر کہنا شروع کر دیا تھا، ابتدا میں اُردو میں شاعری کیا کرتے تھے اور بہت کم کہا کرتے تھے، اس کے بعد فارسی میں بھی کہنے لگے، مسدس و مخمس خوب کہا کرتے تھے، صاحب دیوان تھے اُن کی فارسی کی ایک مرصع و مسجع غزل سنئے، پڑھئے اور جھومئے یہ خیال رہے کہ غزل آج سے ڈیڑھ سو برس قبل کی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آج کی کہی ہوئی ہو، ملاحظہ ہو:-

غارت گرِ صبرِ من و سرگرم فغانے
شد عشوہ گرے، کم سخنے، آفتِ جانے

نازک کمرے، فتنہ گرے، ہوش ربائے
شمشاد قدے، گلبدنے، غنچہ دہانے،

رنگیں چمنے، سبزِ خطے، تازہ بہارے
گلبرگ ترے، لالہ رخے، سروِ روانے

خنجر مژہ و سخت دلے تند مزاجے،
عشاق کشے کینہ ورے، گرم عنانے

خوش چشم بتے، سیم تنے، زہرہ فریبے
جادو نگہے، حور وشے، برقِ جہانے

داریم ظریفؔ از غم و اندوہ فراقش
ہر لحظہ بلب نعرۂ و آہے و فغانے

کر تو اے زہرہ جبیں کوٹھے پہ آ اپنا بناؤ[1]
ماہ تاباں ہے سپے آئینہ داری تیار

ہے ظریفؔ تجھ سے ہی چشمِ وفا کوئی اور بھی سکتا ہے تیرے سوا[2]
مری جان جو تو نہ سنے تو بھلا کہو جا کے وہ کس سے مصیبت دل

اے جنوں نالہ و فریاد کروں یا نہ کروں
خانۂ عشق کو آباد کروں یا نہ کروں

جا پھنسوں دام میں یا دام سے بھاگوں اے دل
تو ہی کہہ خاطرِ صیاد کروں یا نہ کروں

حالت وصل کا اک شب جو سماں دیکھا تھا
کیوں شبِ ہجر اسے یاد کروں یا نہ کروں

روئے[3] گل پر قطرۂ شبنم سے خجلت بنی،
صبحدم آیا جو وہ رشک گلستاں باغ میں

آزاد رہوں کیونکر دیتے[4] ہیں ظریفؔ اب پھر
بے تابیٔ دل مجھ کو پیغام گرفتاری

---

(۶۲) ظہورؔ تخلص، منشی محمد ظہور نام قوم شیخ خلف محمد اسمٰعیل عرف منشی نہال، تاریخ ولادت ۱۲۰۳ھ ابتدائے شباب ہی سے اُردو شاعری کا شوق تھا، اکثر اساتذہ کلام حاصل کر کے استفادہ کرتے تھے، ابتدا میں ہجو موزوں کیا کرتے تھے والد کے انتقال کے بعد مولوی کرم محمد کرمؔ سے سلام و مرثیہ اور دوسری چیزیں دکھاتے رہے جب مولوی صاحب کالپی چلے گئے تو ۱۲۲۳ھ میں مصحفی کے پاس آئے اور شاگرد ہوئے، یہ غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل تھے بہت تھوڑے دنوں میں دو دیوان مرتب کر لئے، دو دیوان کے علاوہ ان کی تصنیفات سے تین کتابیں اور ہیں، انیس ظہور، خاتم سلیمان، اور ایک

---

[1] "آ اپنا بناؤ" سے مفہوم واضح نہیں ہوتا، اس کے لئے میں نے مصحفی کے مطبوعہ تذکرہ کے علاوہ مشرقی کتب خانہ پٹنہ کے قلمی تذکرے بھی دیکھے لیکن اس میں بھی "آ اپنا بناؤ" ہی ہے، شاید کہ یہ "آج اپنا بناؤ" ہے۔ [2] یہ بھی غالباً کتابت کی غلطی ہے "ہے ظریف کو تجھ سے ہی چشم وفا" ہونا چاہئے۔ [3] اس مصرعہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ [4] "دیتے ہیں بے تابیٔ دل" عجب چیز ہوئی شاید کہ صحیح "دیتی ہیں" ہو۔ (مختار الدین)

مثنوی "ظہور عشق"۔ فن کتابت سے بھی واقفیت تھی خوشنویس کے ساتھ ساتھ بہت زود نویس بھی تھے، مصحفی اپنی رائے لکھتے ہیں کہ:۔ "کلامش عاشقانہ است وطبعش در روانی چوں آب رواں"۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

مگر کہ شب کو خیال رخ نگار رہا ۔۔۔ بندھا جو صبح تلک آنسوؤں کا تار رہا

اس بیاباں میں گزر تھا مرا یار جس جا ۔۔۔ محرم آبلہ پایانِ جنوں خار نہ تھا

دیکھ لینے دے دمِ ذبح مجھے جانب یار ۔۔۔ اتنا احساں ہے ترا خنجر خوں خوار بہت

کرے ہے منع جو اے باغباں سیر گلستاں کو ۔۔۔ تجھے گلشن مبارک ہو چلے اب ہم بیاباں کو

اے جوشِ جنوں چاہیے یہ اب کی برس میں ۔۔۔ ثابت نہ کہیں دامن صحرا نظر آوے

کانپ[1] اٹھتا ہے ترے کوچہ سے جو آتی ہے نسیم ۔۔۔ صورت بید کبھو یہ تنِ لاغر میرا

آب و دانہ کی بھی صیاد کو جب ہو نہ خبر ۔۔۔ سمجھے کیا خواہش مرغان گرفتار ہے کیا

دیکھ کر نبض مری روز[2] طبیبوں نے کہا ۔۔۔ کچھ نہیں ہم پہ یہ کھلتا ترا آزار ہے کیا

ملائم ہو گئے ریشم سے وہ جس وقت ہم اینٹھے[3] ۔۔۔ حقیقت کھل گئی ہم پر تمھارے زلف کے بل کی[3]

"ع"

(۶۳) عارف تخلص، میر عارف علی نام متوطن قصبۂ امروہہ، یہ امروہہ کے سادات میں سے تھے کچھ دنوں تک مرادآباد میں اقامت اختیار کی، یہ بہت ذی فہم و ذی فراست شخص تھے، عروض و قافیہ بھی اچھی جانتے تھے[4]۔ بینی پرشاد ظریف کے ساتھ مصحفی کے پاس آئے اور شاگردی اختیار کی بعد کو شاعری ترک کرکے پند و نصیحت اور خدمت خلق میں مشغول ہو گئے۔ فارسی اور اردو دونوں میں اشعار کہا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

رات ساری مجھے دونوں کی تسلی میں کٹی ۔۔۔ ہاتھ دل پر سے اٹھایا تو جگر پر رکھا

ہاتھوں کو چاک جیب تلک دسترس نہیں ۔۔۔ میں کس کے بس میں ہوں کہ مرا کچھ بھی بس نہیں

وہ ہوا گرد سے جب وقت شکار آلودہ ۔۔۔ تیر خاکی ہے مژگان غبار آلودہ

ناوک نازت تو تا بر جگر من بنشست ۔۔۔ شد جگر روزن و دل در پس روزن بنشست

کرا اے کشتۂ شمشیر ابروئے تو می آید ۔۔۔ کہ بانگ شور محشر از سر کوئے تو می آید

---

[1] یہ مصرعہ میرے خیال میں ناموزوں ہے۔ [2] "و" گرتا ہے وزن میں۔ [3] یہ شعر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، زلف کے بل کو اینٹھنا ٹھیک نہیں زلف کو اینٹھنا صحیح ہوتا، لیکن اس صورت میں مصرع اول غلط ہوگا، فعل زلف کی رعایت سے نہیں لائے گئے ہیں۔ [4] گلشن بیخار شیفتہ [illegible] قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور

(۶۴) عاصی تخلص، حافظ قاسم علی خاں نام، متوطن قصبہ ردولی، یہ ایک غریب آدمی تھے اور نابینا، پھر بھی بمقتضائے موزونی طبع اشعار کہا کرتے تھے، دو تین اُردو کی غزلیں مصحفی کو دکھلائی تھیں، مصحفی لکھتے ہیں:- "اگرچہ زبانش درست است امّا از محاورہ ریختہ بلند نیست"۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

شاید کوئی بے درد مجھے یاد کرے ہے — جو مثل جرس دل مرا فریاد کرے ہے
خواہش سیر چمن کب اسے ہووے جس کو — آپ سینہ ہی میں داغوں کی بہار آئے نظر
تو ہی نہ اگر پاس مرے آن رہے گا — کس طرح سے پھر جان مرا[1] جان رہیگا

---

(۶۵) عبرت تخلص، نواب حسن علی خاں نام، عرف بڑے مرزا لکھنؤ کے رہنے والے خلف نواب محمد علی خاں، صاحب دیوان گزرے ہیں

تکیے میں دفن ہیں، ہوں وہ ہی کوئے یار میں — میرا الگ مزار جدا ہے مزار دل
گرد کدورت آئینہ رو کی مٹی نہ ہائے — ہر چند آب گریہ سے دھویا غبار دل

صاحب سراپا سخن نے بھی ایک شعر دیا ہے:-

روئے کیا کیا نہ شب ہجر پریشانی میں — نہ ہوا پر نہ ہوا ہائے وصال کا کل

---

(۶۶) عدل تخلص، شیخ فضل الرحمٰن نام ساکن بداؤں یہ ایک غریب آدمی تھے جس زمانہ میں مصحفی میاں غلام اشرف کے یہاں قیام پذیر تھے اور مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے یہ اکثر شریک مجلس ہوا کرتے تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

دل میں آتا ہے کہ اب محتسب و قاضی کو — جمعہ کے روز لڑا دیجئے پالی سب کیجئے

---

(۶۷) عشاق تخلص، شاہ مظہر الحق نام، یہ حضرت درویش ہونے کے باوجود خوش جمالوں سے بہت مراسم رکھتے تھے" مصحفی کی شاگردی میں بغیر کسی کی ترغیب کے آئے، آخر عمر میں انھوں نے عزلت نشینی اختیار کرلی تھی۔ نمونہ کلام دیکھئے:-

یوسف کے مرقع پہ جو حیراں ہوا مالی — تب میں نے بغل سے تری تصویر نکالی
ادب عشق سے تڑپا نہ میں خنجر کے تلے — تر لہو سے مرے تا دامن جلاد نہ ہو
گر رہا وصل میں محروم گلا کیا اس کا — دیکھنا تھا یہ ستم اپنے مقدر سے مجھے

---

(۶۸) عیاش تخلص، میر محمد یعقوب نام ولد میر محمد انور، لکھنؤ میں نشو و نما پائی، ان کے آبا و اجداد شاہجہان آباد کے

---

[1] جان کو انھوں نے مذکر استعمال کیا ہے۔

رہنے والے تھے: ابتدائے جوانی ہی سے شعر کہنے کا خیال تھا، اساتذہ سے خوب خوب ملاقاتیں کیں اور ان کی صحبت میں رہکر ان سے خوب مستفیض ہوئے، ابتدا میں اپنے اشعار میر سوز کو دکھائے پھر میر قمر الدین منت کو اور آخر میں مصحفی سے مشورۂ سخن کرنے لگے، مصحفی اپنے تذکرہ میں ان پہ رائے دیتے ہیں کہ:- "غزل درست بستہ می گوید در کلامش چنداں جائے اصلاح یافتہ نمی شود مگر گاہے گاہے کم کم"- نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

قدرت خدا کی دیکھو مرے دل کے زخم کو ــــ چھڑکے تھا جو نمک وہی مرہم لگا گیا
سجدہ کروں ہر بت کو میں اے کاتب قدرت ــــ لکھا ہی تھا تو نے مگر میرے جبیں پر
جدائی میں جیوں کب تک میں عیاش ــــ بھلی ہے موت ایسی زندگی سے

---

(۶۹) عیشی تخلص، طالب علی خاں نام ولد علی بخش خاں، فارسی و اردو دونوں میں مشق سخن کیا کرتے تھے، فارسی میں قتیل اور اردو میں مصحفی سے اصلاح[1] لیتے تھے، دیوان فارسی و ریختہ و مجموعہ نثر و سرد چراغاں ان کی تصنیفات سے ہیں، حسرت موہانی نے قلمی دیوان کا انتخاب شایع کیا تھا نظم کے علاوہ نثر میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، مصحفی لکھتے ہیں:- "شعر فارسی و بندی بمتانت و رزانت تمام می گوید و بالفعل خود اُستاد وقت است"- نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

سوختن گرمی ہنگامہ آواز من است ــــ رقص بسمل اثر زمزمۂ ساز من است،
کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہ تھا ــــ اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا
دل گرفتہ ہوں کروں گا ہو کے میں آزاد کیا ــــ مجھ کو یکساں ہے چمن کیا خانۂ صیاد کیا
میں نے عیشی سے جو پوچھا دل پرخوں کا حال ــــ اک صراحی سے مئے گلگوں کی بھری دکھلائی،

"غ"

(۷۰) غافل تخلص، منور خاں نام ولد صلابت خاں افغان، ان کے آبا و اجداد فیض آباد کے رہنے والے تھے، خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے احاطہ فقیر محمد خاں "یا میں آپ کا قیام تھا نہایت صاحب کمال اور خوش بیان شاعر تھے، مکتب نشینی ہی کے وقت سے شعر کہنا شروع کیا تھا یہاں تک کہ شاہ مظہر عشاق کی خدمت میں آئے اور شاگرد ہوئے، بعد کو مصحفی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف تلمذ حاصل کیا، ان کے متعلق مصحفی کی رائے سنئے لکھتے ہیں:- "شعر بطور سادہ و پرکاری گوید و در غزل سلامت کلامش مثل سلک گوہر است"- صاحب دیوان تھے، دیوان نولکشور پریس نے ۱۸۸۹ء میں چھاپکر شایع کر دیا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:- عبث وہ شرگیں رہتا ہے اب مستور آنکھوں سے ــــ کہ رو رو تے رو تے اب جاتا رہا ہے نور آنکھوں سے

---

[1] یہ صاحب گلشن بیخار اور دوسرے تذکرہ نگاروں کا بیان ہے لیکن مصحفی نے اپنے تذکرہ میں اپنے اُستاد ہونے کا ذکر نہیں کیا ہو بلکہ لکھا ہے کہ انشاد اور قتیل سے کسب فیض کیا۔

جب آیا رحم عریانی پہ میرے دیدۂ تر کو — پنہایا پیرہن آبِ رواں کا جسمِ لاغر کو
طوافِ کعبہ کو جو دل کھینچے ہے گاہے گاہے — کوئی تسبیح کا رشتہ مری زنار میں ہے
سبک ساروں کو کچھ خطرہ نہیں قہرِ الٰہی سے — خس و خاشاک کشتی جانتے ہیں موجِ طوفاں کو
صدمۂ ہجر مری جان اُٹھانے کی نہیں، — تو نہ آوے گا تو کیا موت بھی آنے کی نہیں[1]
اپنے مجنوں کی ذرا دیکھ تو بے پروائی، — پیرہن چاک ہے اور فکر سلانے کی نہیں

"ف"

(۸۱) فرد تخلص، وحیدالدین خاں نام عرف خدابخش خاں ولد محسن خاں قوم یوسف زئی باشندۂ دربھنگہ (بہار) مقیم کانپور پیشہ مولوی گری کا "شاعروں میں اپنے تئیں سب سے اونچا جانتے تھے[2]" عربی و فارسی بھی بقدرِ ضرورت حاصل کی تھی، صاحبِ دیوان تھے چند شعر ملاحظہ ہوں، ان کے اشعار میں رعایتِ لفظی پائی جاتی ہے:-

کبھی کعبہ کبھی بت خانہ ہے مسکن اپنا — دین و مذہب کہوں کیا شیخ و برہمن اپنا
بیتاب ہوں میں تشنگیِ نزع سے قاتل — ٹپکا دے تو آبِ دمِ شمشیر گلے میں
آسیب پری ہوتا ہے جب سیمبروں کو — تعویذ میں کرتے تری تصویر گلے میں

ان کے اشعار میں ابتذال بھی پایا جاتا ہے:-

بند انگیا کے نہ بند ہوا سے کبھی، — عمر بھر بندہ تو نا محروم رہا،
سطحِ سینہ پر ترے اے بتِ نوخیز کیا — اُبھرا اُبھرا نظر آتا ہے کچھ اُٹھا اُٹھا
وہاں چھاتی ہے گدرائی نہ ہو کیونکر یہاں کھٹکا — درخت بار ور میں باندھتا ہے باغباں کھٹکا

---

(۸۲) فدا تخلص، فدا حسین نام خلف ضیاء الدین حسین خاں عرف آقا مرزا، بنیرۂ نواب حاتم خاں قوم مغل، لکھنؤ کے رہنے والے، فنِ رمل میں بے نظیر اور طبابت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، ابتدا میں اپنے اشعار پسر میر قمرالدین منت یعنی میر نظام الدین کو دکھاتے تھے بعد کو بعض مجبوریوں کی بنا پر مصحفی کو دکھانے لگے اور انھیں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

خفا ہم آپ ہیں اس سے یہ دم رہے نہ رہے — ترے فراق میں اے یار ہم رہے نہ رہے

---

[1] اس مضمون سے کچھ الگ ہو کر غالب نے بھی کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے:-

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں، — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

[2] سراپا سخن صد ۲۰۴

ناکام کیا رہیں گے کچھ کام کر رہیں گے — بدنام ہوں گے تو بھی اک نام کر رہیں گے
رہائی دام سے صیاد کے دشوار ہے ہم کو — چمن میں دیکھئے پھر بھی ہمارا آشیاں ہوگا
مبتلا عشق کا اک شخص ندا نام جو تھا — مرگیا سر کو پٹک کے کسی دیوار کے ساتھ

---

(۷۳) فریاد تخلص، میرزا مغل بیگ، نام ولد مرزا علی نقی بیگ، آبا و اجداد انکے ولایتی تھے، وہاں سے پہلے شاہجہاں آباد آئے پھر لکھنؤ میں مقیم ہوئے، ان کی پیدائش لکھنؤ ہی میں ہوئی، الہ آباد میں رجسٹری کے سررشتہ دار تھے، شروع شروع مرثیہ وسلام کی طرف راغب رہے اور افسردہ سے اصلاح لیتے رہے پھر غزل کی طرف مائل ہوئے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے نساخ نے سخن شعرا میں لکھا ہے[۳۶۷] کہ انھوں نے ناسخ سے بھی اصلاحیں لیں تھیں، صاحب دیوان گزرے ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں

دن رات آتش غم بھڑکے ہے تن کے اندر — شعلے سے بھڑکے ہیں کچھ میرے بدن کے اندر
کس کے بدن کی نکہت لائی صبا چمن میں — پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر
دل یہ بھرا کہ جوش سے آنسو ٹپک گئے — ساغر ہماری چشم کے آخر چھلک گئے
سو بار بہا یا فلک نیلوفری کو — کب اشک کا قطرہ مرے طوفاں نہیں ہوتا
میکشو میں رند ایسا ہوں کہ میرے واسطے — خم اٹھا کر لائے خود پیر مغاں بالائے سر

---

(۷۴) فصاحت تخلص، میر بندہ علی نام ولد میر علی، آبا و اجداد اسلام آباد کے رہنے والے تھے، خود لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی، کمسنی ہی میں شاعری شروع کی اور اچھا کہنے لگے، ۱۱ برس کے تھے کہ انھوں نے یہ شعر کہے:۔

آپ کو حال پریشاں سے مری کیا کام ہے — آپ بیٹھے چین سے زلفیں بنا یا کیجئے
تب ہمیں صیاد نے چھوڑا قفس سے بانصیب — جب چمن سے پھول گلچیں جھولیاں بھر لے گئے
اگلی سی نہ وحشت ہے نہ اب شور جنوں ہے — کیا بھول گیا ہاتھ مرا جامہ دری کو

---

(۷۵) فیض تخلص، نواب جعفر حسن خاں نام خلعت نواب محمد علی خاں، محلہ سنگی والان پٹنہ کے رہنے والے، اپنے وقت میں رکن رکین شہر تھے، عالی خاندان اور متمول، عربی و فارسی سے بھی واقفیت تھی اور اس میں شعر بھی کہتے تھے، خط نستعلیق کے اُستاد تھے لکھنؤ جاکر مصحفی سے شرف تلمذ حاصل کیا[۱]

آسماں پر اشک کو لے جائے گی تحریک آہ — یہ ہوا اُٹھتی ہے دریا موج خوں ہو جائیگا

---

[۱] سخن شعرا مصنفہ نساخ ص۳۶۷ و ندیم (بہار)

رشتۂ تسبیح اپنا ہوگیا تارِ نفس، ذکر ہو موقوف تیرا گر یہ دم بھر ٹوٹ جائے
کیسی پابندی ہمیں زنداں کی اور زنجیر کی، وہ جنوں کو زور ہے سدِّ سکندر ٹوٹ جائے
مے پینے کی تہمت تو دے سکتا نہیں لیکن آنکھوں میں گلابی سا ڈورا نظر آتا ہے
فیض اب اس کو ندامت ہے نمک پاشی سے تیرے زخموں نے عبث اس پہ شکر خند کیا

"ق"

(۷۶) قاصر تخلص، میرزا برعلی بیگ ولد میرزا رستم علی بیگ سمرقندی، مولد و موطن شاہجہاں آباد، اصل وطن سمرقند تھا، زمانہ تک لکھنؤ میں مقیم رہے ابتدا میں جو کچھ موزوں کرتے رہے ثناء اللہ فراق کو دکھاتے رہے، بعد کو مصحفی کے شاگرد ہوئے، ذریعہ معاش تجارت اور سپہگری تھا، صاحب دیوان تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

تو تو ہے صیاد عالم سچ بتا کیونکر ہوا طائرِ رنگِ حنا آزاد تیرے ہاتھ سے
ان دنوں جوش پہ ہے دیدۂ گریاں اپنا اے صبا کہیو بھگا تا کرے طوفاں اپنا
نسیم پر نہ کھلا آج تک کلی کا بھید کسی ہی پر نہیں کھلتا میاں کسی کا بھید

قاصر کے تین شعر قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ میں ملے جو درج ذیل ہیں:۔

نالہ کیجئے جو کبھو سوزِ نہاں سے پیدا شمع ساں چاہئے ہو شعلہ زباں سے پیدا
میرے آگے نہ کسی غیر کا تو دل رکھنا سنگ اچھا نہیں شیشہ کے مقابل رکھنا
کس رنگ سے گلشن میں کروں گل پہ نظر میں اب غنچہ صفت باندھ چکا رختِ سفر میں

---

(۷۸) قسمت تخلص، نواب شمس الدولہ خلف نواب بارگاہ قلی خاں دہلوی مقیم لکھنؤ، مرزا جہاندار شاہ کے دربار میں ان کا بڑا اقتدار تھا اصلاح سخن میاں جعفر علی حسرت سے لیتے تھے، اُن کے انتقال کے بعد مصحفی کی طرف رجوع ہوئے اور انھیں سے اصلاح لینے لگے، سلام و مرثیہ کا بھی انھیں شوق تھا، غزل کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

الٰہی[1] یا تو میرے دامنِ دلدار ہاتھ آئے نہیں تو ہاتھ کے اس کی جو بتہ تلوار ہاتھ آئے
پھر[2] مجھ کو کیا جو غیر کے تم جاکے گھر رہے میرے تو ساتھ وعدے ہی شام و سحر رہے
آتی نہیں کسی کی جواب تک صدائے پا واماندگانِ قافلہ یارب کدھر رہے

لہ ۲ہ ناسخ مصنف تذکرہ سخن شعرا نے اپنے تذکرہ میں ان دو شعروں کو اختلافِ الفاظ کے ساتھ لکھا ہے:۔
الٰہی یا تو میرے دامنِ دلدار ہاتھ آئے نہیں تو ہاتھ کی اس کے کوئی تلوار ہاتھ آئے
پھر مجھکو کیا جو غیر کے تم جاکے گھر رہے میرے تو ساتھ وعدۂ شام و سحر رہے
(مختار الدین)

قسمت جو سیکھتا ہے فرنگی زبان کو — شاید نظر پڑا ہے فرنگی بچا کوئی

"ک"

(۷۹) کامل تخلص، شیخ جمال الدین نام، آنولہ کے رہنے والے، مصحفی کے شاگرد تھے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

فصل سودے کی پھر آئی ہے خدا خیر کرے — دیکھئے پڑتا ہے کس کس پہ وبالِ کاکل

آغاز میں عیاں ہے یہ انجام کارِ دل — دو چار دن ہے زندگی مستعار دل

فوج غم والم میں پھنسا شہر یارِ دل — ہو کون بے کسی کے سوا غمگسارِ دل

بحر جہاں میں ہے یہی کامل کی آبرو — ہو زیب گوش یار درِ شاہوارِ دل

---

(۸۰) کاہش تخلص، مولوی اولاد علی نام جونپور کے رہنے والے، یہ صاحب گنج گیا عدالت کے پیشکار تھے، نمونہ کلام ملاحظہ ہو

بیان حال دل زار ہو نہیں سکتا — یہ درد وہ ہے کہ اظہار ہو نہیں سکتا

رشک مقتل ہے ترا کوچہ بت کافر گر — گبر تڑپے ہیں جدا، کافر جدا، ترساجدا

بھر گئے زخم جگر جب شب سنی تقریر زلف — مثل برہم ہو گئی اللہ رے تاثیر زلف

دو ہری زنجیروں میں کس پیچ و جکڑے ہیں دل — واہ ری تدبیر کاکل واہ ری تاثیر زلف

جناب عرش گیاوی مصنف حیات تسلیم کے بیان کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ شعر بھی کاہش ہی کا ہے:-

شعلۂ غم یوں تڑپتا ہے دل مایوس میں — جھلملائے شمع کی لو جس طرح فانوس میں

"گ"

(۸۱) گرم تخلص، میرزا حیدر علی نام، امتیاز علی بیگ کے لڑکے، شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ صاحب تذکرۃ الشعرا نے لکھا ہے کہ ان کا قیام "پنولا" حیدرآباد میں اکثر رہتا تھا۔ مصحفی لکھتے ہیں:-

"جوان صلاحیت شعار ہست بمقتضائے موزونی طبع چیزے کہ موزوں می کند آں را بنظر اصلاح فقیر می گزراند...

... باوصف نو مشقی از ذکاوت طبعش معلوم می شود کہ بشرط امتزاد لت بجائے خواہد رسید"

یہ مصحفی کے خاص شاگردوں میں تھے۔ ناسخ[۱] لکھتے ہیں کہ شعر اچھا کہتے تھے دکن کی طرف جا کر انتقال کیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

نالہ کی گرمیوں سے بھنتے دل وجگر ہیں — لب خشک ہو رہے ہیں کانٹے زبان پر ہیں

---

[۱] سخن شعرا (ناسخ) صفحہ مطبوعہ نول کشور پریس

شب رخصت ہے رہو تم مرے گھر آج کی رات — جاں بلب چھوڑ کے جاتے ہو کدھر آج کی رات
کر دیا در کو اجابت کے خدایا کیا بند — نہیں کرتی جو دعا میری اثر آج کی رات
سیل گریہ میں نہ ہم تا بہ کمر ڈوب گئے — اس قدر روئے کہ ہمسایوں کے گھر ڈوب گئے
گلچیں جوان کو توڑ کے ڈالی سے لے چلا — سر دھن کے عندلیب پکاری کہ ہائے دل
تیغ نگاہ کس کی دیکھی ہے ہم نے یارب — کیوں زندگی سے اپنی بیزار اس قدر ہیں

(باقی) مختار الدین آرزو

چند قابل مطالعہ کتابیں

کسان :- مصنفہ چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم، ایل، اے، ایم، ایل، سی، مترجمہ مولوی محمود علی خانصاحب (جامعی) قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی، پھر کس طرح رفتہ رفتہ اسے خوش حال سے محتاج بنایا گیا! اور اس حالت کو پہونچا دیا کہ تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دو وقت کھانے کو روٹی بھی نہیں! اس کتاب میں ان اُمور پر مفصل بحث کی گئی ہے اور اس مصیبت کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔ ۵۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد عہ

مضامین رشید :- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عار

میدان عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جوان کے تمام پچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد عہ

بیوہ :- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہئے۔ قیمت مجلد عہ

منیجر نگار لکھنؤ

جنگ کا ہولناک خراج نوعِ انسانی سے

سنہ ۱۴۶۹ قبل مسیح سے سنہ ۱۹۳۰ء تک (دو ہزار تین سو ننانوے سال کے زمانہ میں) صرف ۲۸۷ سال تو ایسے گزرے ہیں کہ دنیا میں امن رہا ہو ورنہ باقی ۲۱۱۲ سال جنگ ہی میں بسر ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۵۰۰ ق۔م سے سنہ ۱۸۶۰ء تک تقریباً آٹھ ہزار عہدنامے صلح کے مختلف ملکوں کے درمیان ہوئے، لیکن انمیں سے کسی کی عمر دو سال سے زیادہ نہ تھی۔ سی سالہ جنگ کے زمانہ سے جو سنہ ۱۶۱۸ء میں شروع ہوئی تھی، ۱۰۰ بڑی بڑی جنگیں ایسی ہوئی ہیں جن میں فرانس نے نمایاں حصہ لیا اور اس کے بعد آسٹریا ہنگری اور برطانیہ نے۔ پروشیا کی جنگی سرگرمیاں سنہ ۱۷۴۰ء سے شروع ہوتی ہیں۔

اس زمانہ میں فرانس ۷۲ سال تک برطانیہ سے لڑتا رہا، ۸۰ سال تک جرمنی سے اور ۹۲ سال تک اسپین سے۔ تاریخ حاضرہ کی سب سے طویل جنگ وہ ہے جو مابین فرانس و برطانیہ سنہ ۱۳۳۷ء سے شروع ہو کر ایک صدی تک جاری رہی اور سب سے مختصر جنگ وہ ہے جو سنہ ۱۸۴۹ء میں سارڈینیا اور آسٹریا کے درمیان صرف چھ دن قائم رہی۔

پروفیسر سوروکن اور لفٹنٹ جنرل گوبودن نے دوسرے زاویہ سے اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ ۵۰۰ سال قبل مسیح سے سنہ ۱۹۲۵ء تک، یونان، رومہ، وسط یوروپ، جرمنی، اطالیہ، فرانس، برطانیہ، نیدرلینڈ، اسپین اور روس نے ۹۰۲ باقاعدہ جنگوں میں حصہ لیا ہے۔ بارھویں تیرھویں صدی میں روس کو زیادہ جنگ میں مبتلا رہنا پڑا، چودھویں صدی میں انگلستان کو، پندرھویں سولھویں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں آسٹریا (یعنی رومہ کی سلطنت مقدسہ) کو اور انیسویں صدی میں فرانس کو اور اس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ تہذیب کی اشاعت جنگ سے باز نہیں رکھتی جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ جنگ عظیم ہے جو سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔

کیمیاوی طریق جنگ

زمانہ قدیم میں بڑی بڑی بری و بحری فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوا کرتی تھیں لیکن ان کا اوسط (سنہ ۱۵۰۳ء سے سنہ ۱۶۱۸ء تک) پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں رہا۔ اٹھارویں صدی میں یہ اوسط ۴۰ ہزار ہو گیا اور نپولین کی جنگوں میں ایک لاکھ تک پہونچ گیا۔

اس کے بعد لیپزگ کی جنگ (سنہ ۱۸۱۳ء) میں ۵ لاکھ سپاہی شریک ہوئے، ۳ لاکھ ۲۰ ہزار جنگ سڈان میں (سنہ ۱۸۷۰ء) اور جنگِ عظیم کے ۸۴ میل لمبے اطالوی محاذ پر ۴۸۰۰ توپوں نے سولہ دن میں ۲۰ لاکھ گولے برسائے جن کے مصارف کا اندازہ ۳ کروڑ پونڈ (تقریباً ۴۰ کروڑ روپیہ) کیا جاتا ہے۔

دھوئیں اور آگ کا استعمال گیارھویں صدی میں چین کے اندر پایا جاتا تھا۔ مغلوں نے سب سے پہلے تیرھویں صدی حملۂ یوروپ کے وقت اس کا استعمال کیا اور اسی کے ساتھ غلیظ کی ہانڈیاں بھی پھینکیں تاکہ ان کی بو سے دشمن ہٹ جائے۔ یہ تھی ابتدا کیمیاوی طریق جنگ کی۔

موجودہ کیمیاوی طریق جنگ کا عملی تجربہ گزشتہ جنگ میں کیا گیا اور تقریباً تین ہزار چیزوں میں سے صرف بارہ چیزیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ اگرچہ گیس کی لڑائی ۱۹۲۱ء کی واشنگٹن کانگرس میں ممنوع قرار دی جا چکی ہے، لیکن اس نے کوئی قانونی صورت اختیار نہیں کی اور ہر قوم زہریلی گیس طیار کر رہی ہے۔ حبشہ کی لڑائی میں اطالیہ نے اس کو استعمال کیا اور جاپانی چین کے حملہ میں برابر اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

توپ اور بارود کی ایجاد کہا جاتا ہے کہ بارود سب سے پہلے چھٹی صدی میں چین نے ایجاد کی، لیکن اس کا استعمال صرف آتشبازی کی حد تک محدود تھا۔ سب سے پہلا دستی بم جو بارود سے طیار کیا گیا وہ تھا جسے مغل سردار قبلائی خاں نے سنہ ۱۲۳۲ء میں استعمال کیا۔ بارود کے اجزاء نویں صدی ہی میں معلوم ہو گئے تھے، لیکن اس کو طیار کیا ایک انگریزی راہب نے تیرھویں صدی میں۔

یوروپ میں بارود کا استعمال سب سے پہلے محاصرۂ اشبیلیہ میں کیا گیا (سنہ ۱۲۴۷ء) اس کے بعد جنگ کرتسی میں (سنہ ۱۳۴۶ء)، پھر جرمنی میں اینیک کی محافظت کے لئے (سنہ ۱۳۶۵ء) غیر دُخانی بارود کی ایجاد سنہ ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔

توپوں کا استعمال بحری جنگ میں ہوتا تھا اور سب سے پہلے سنہ ۱۳۳۸ء میں ان کا استعمال کیا گیا اس کے بعد سنہ ۱۵۱۲ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی بحری جنگ میں دونوں طرف توپوں کا استعمال ہوا۔ محمد ثانی سلطان ترکی نے محاصرہ اورنہ کے لئے ایک بہت بڑی توپ ڈھلوائی تھی جس میں ۳۰۰ پونڈ کا سنگین گولا رکھا جاتا تھا اور جس کی آواز تیرہ میل تک جاتی تھی۔

پیچھے سے بھرنے والی توپ کا خاکہ ایک اطالوی نے سنہ ۱۵۹۷ء ہی میں طیار کر لیا تھا۔ لیکن اس قسم کی فولادی توپ سب سے پہلے کارخانہ کرپ نے سنہ ۱۸۵۶ء میں ڈھالی اور سنہ ۱۹۱۰ء تک اس میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس کی مار ۶ میل کی ہو گئی۔ گزشتہ جنگ میں جرمن کی بڑی توپ سے ۳۰۰ گولے سر کئے گئے جو ۲۵ میل تک بلندی میں اور ۸۰ میل تک سامنے میدان میں پہونچے تھے۔ اس کے گولہ کا وزن ۳۳۰ پونڈ تھا جو ۵ ہزار فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے

چلتا تھا - ۱۶ انچ کے پھٹنے والے گولہ کی قوت کا اندازہ یوں کیجئے کہ گویا ریل کے چار ڈبے ۹۰ میل کی رفتار سے ایک دیوار سے ٹکراتے ہیں - سب سے بڑی توپ اسوقت امریکہ کے پاس ہے جس کی مار ۳۰ میل تک ہے -

گزشتہ جنگ عظیم میں ذخائر حرب کے صرف کا اندازہ مشکل ہے، یکم جنوری ۱۹۱۸ء سے فرانسیسی کارخانوں نے جو ذخائر حرب طیار کرنے شروع کئے، ان کا روزانہ اوسط ایک لاکھ ۵۰ ہزار بلٹے اور ۴۰ ہزار ونی گولے تھے - ۳۰ کروڑ دستی بم جرمن محاذ پر تقسیم کئے گئے اور وردون کے مقام پر ایک مہینے کے اندر تیرہ لاکھ ٹن لوہا گولوں اور گولیوں کی صورت میں برسایا گیا -

فوجی جوتے اور زین

فوجی جوتوں کا ذکر مسیح سے دو ہزار سال قبل مصری مخطوطات میں پایا جاتا ہے - گھوڑوں کی نعلبندی کی ابتدا ۳۰۰ء سے ظاہر ہوتی ہے - اس سے قبل جاپانی گھوڑوں کی نعل گھاس سے طیار کرتے تھے - جب قدیم اہل رومہ نے دیکھا کہ ان کی پختہ گلیاں گھوڑے کے سموں کو نقصان پہونچاتی ہیں تو انھوں نے چمڑے کے نعل استعمال کئے -

قدیم رومہ و یونان میں رکابوں کا بھی استعمال نہ تھا، یوروپ میں اس کا رواج سرماتیوں (Sarmatians) سے آیا جن کی اولاد اب روس میں پائی جاتی ہیں - زینوں کا استعمال البتہ بہت قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے، جو مختلف وضع و صورت کی ہوا کرتی تھیں - قدیم اسیریا میں بھی گھوڑوں پر زین کسی جاتی تھی - اہل رومہ اپنے گھوڑوں کی پیٹھ پر کپڑا، چمڑا اور سمور ڈالتے تھے

جھنڈے

قدیم مصری فوجیں بھی جب لڑنے جاتی تھیں، تو ان کے ساتھ جھنڈے ہوتے تھے - ان پر بیل اور گھڑیال کی تصویر ہوتی تھی کیونکہ ان کے یہاں یہ دونوں چیزیں مقدس تھیں -

اسیریا والوں کے جھنڈے پر فاختہ بنی ہوتی تھی اور ایرانیوں کے جھنڈے پر سنہرا عقاب - اسپارٹا کے جھنڈوں پر ہرا قلس کی تصویر ہوتی تھی اور یونان کے جھنڈوں پر سرخ اُلو کی -

رومہ والے عقاب، بھیڑئے، سؤر اور گھوڑوں کی تصویر اپنے جھنڈوں پر بناتے تھے - قسطنطین اعظم کے زمانہ میں صرف صلیب رہ گئی - سیکسن اقوام کے جھنڈوں پر شیر، اژدہے اور عقاب بنے ہوتے تھے -

مغلوں کے جھنڈے، گھوڑوں کی دُم کے ہوتے تھے اور تعداد کے لحاظ سے ان دُموں میں چار تک کا اضافہ ہوتا تھا - چین کا جھنڈا زرد رنگ کا تھا جس پر نیلا اژدھا بنا ہوتا تھا - مسلمانوں کا جھنڈا سبز ہوتا تھا اور اس پر کوئی تصویر نہ ہوتی تھی - جرمنی کا دوہرے سر والا عقابی جھنڈا مشرقی سلطنت رومہ سے لیا گیا - شاہی جھنڈوں میں عقاب کی تصویر یوروپ کے اکثر ملکوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ عقاب، کو اکثر قوموں میں قوت و ہوشیاری کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے -

نعرۂ جنگ

یونانیوں کا نعرۂ جنگ الالا - الالا تھا اور اسی کو اب فاسسٹ جماعت نے اختیار کیا ہے، اہل رومہ فری - فری کہا کرتے تھے، صلیبی فوجوں کا نعرہ "Adjuva Deus" (خدا ہماری مدد کرے) تھا - روسیوں کا نعرۂ جنگ وہی تھا جو تاتاریوں کا یعنی ہُرا، ہُرا جس کے معنے ہیں "مار ڈال - مار ڈال"۔ انگریزوں کا نعرہ تھا "St. George for England"، فرانس والوں کا نعرہ کسی وقت "Mont joie st: Deuis" تھا لیکن اب "En avant" (آگے بڑھو) ہے - اہل اسپین کا نعرہ "San Jago" تھا اور مسلمانوں کا اللہ اکبر!

فوجی تنظیم

مسیح سے ۳۰۰۰ سال قبل مصر میں یہ رواج تھا کہ ہر ضلع کی علٰحدہ فوج ہوا کرتی تھی جو جنگ کے وقت مرکزی فوج میں شامل ہو جاتی تھی - یہ فوج صرف نیزہ برداروں اور تیر اندازوں پر مشتمل ہوتی تھی - تلوار، خود اور زرہ وغیرہ کا پتہ نہ تھا - اس کے ۱۵۰۰ سال بعد مصری افواج میں تیشوں، چھوٹی تلواروں اور رتھوں کا استعمال شروع ہوا لیکن افسروں کے ہاتھ میں بجائے ڈنڈوں کے پنکھے ہی رہا کرتے تھے۔

بابل، میڈیا، اور اسیریا میں سوار و پیادہ فوج کے علاوہ رتھ سوار بھی پائے جاتے تھے - مستقل فوج کا رواج سب سے پہلے ایرانیوں کے یہاں ہوا، ایرانی افواج سے وفاداری کا حلف بھی لیا جاتا تھا اور سالانہ باڈی گارڈ کی افواج کا معائنہ بھی ہوتا تھا، اس کی تعداد دس ہزار تھی۔

پارتھیا کی سوار فوج بہترین مانی جاتی تھی اور زرہ بکتر سب سے پہلے اسی نے استعمال کیا - یونانیوں کی فوج زیادہ تر شہری لوگوں پر مشتمل تھی جنھیں کوئی تنخواہ نہ ملتی تھی اور غلاموں کو بھی ضرورت کے وقت مسلح کر دیا جاتا تھا۔

اسپارٹا میں بھی مستقل فوج رہتی تھی اور دوسری صدی قبل مسیح میں اہل رومہ بہترین جنگجو سپاہی مانے جاتے تھے اور ۲۳ ق-م - وہاں کے افواج کی تعداد ۴ لاکھ ۵۰ ہزار تھی۔

قدیم جرمنی میں اضلاع کی اپنی فوجیں جمع کیا کرتی تھی، بعد کو یہ حکم بادشاہ کی طرف سے صادر ہونے لگا - شارلیمین کے زمانہ سے (۷۴۲ء — ۸۱۴ء) باقاعدہ فوج کی بھرتی ہونے لگی، لیکن یہ بھرتی کسی ایک جماعت کی طرف سے نہ ہوتی تھی، حکومت، مذہب، جاگیردار، امراء علٰحدہ علٰحدہ بھرتی کرتے تھے۔

مسلح گاڑیاں اور ٹینک

جنگی رتھ سب سے پہلے اسیریا کی فوج میں پائے جاتے تھے جس کی ترقی یافتہ صورت آج کل کے مسلح موٹر کار اور ٹینک ہیں۔

۱۸۵۵ء میں کوون نے جو مسلح گاڑی طیار کی تھی وہ اسی وجہ سے ناکام رہی کہ اس کے چلانے کے لئے ایندھن کافی مقدار میں رکھنا پڑتا تھا، اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں ڈیملر نے مسلح گاڑی طیار کی جس پر ایک تیز چلنے والی توپ بھی رہتی تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں سب سے پہلے فرانس نے مسلح گاڑیوں سے محاذ جنگ پر کام لیا۔ اور سنہ ۱۹۳۶ء کی ابتدا میں روس کے پاس چھ سے دس ہزار تک ٹینک پائے جاتے تھے، فرانس کے پاس ۵۰۰۰، برطانیہ اور پولینڈ کے پاس علٰحدہ علٰحدہ ۶۰۰، زیکوسلوویکیا کے پاس ۳۵۰، اٹلی کے پاس ۳۲۰، یگوسلوویا کے پاس ۱۲۰ اور رومانیا کے پاس ۹۰

جنگ اور اتلاف جان

جنگ سی سالہ میں جو سنہ ۱۶۱۸ء سے سنہ ۱۶۴۸ء تک جاری رہی، جرمنی کے ایک کرور ۲۰ لاکھ آدمی ضایع ہوئے جن میں ۹ لاکھ صرف سیکسنی کے تھے اور ورٹمبرگ کی آبادی ۹ لاکھ سے گھٹ کر ۵۰ ہزار رہ گئی۔

انقلاب فرانس اور نپولین کی لڑائیوں نے فرانسیسی آبادی کو جس قدر نقصان پہونچایا، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک کرور سپاہی نپولین کی جنگوں میں ختم ہو گئے۔ ۶ لاکھ کی فوج جو سنہ ۱۸۱۲ء میں روس پر حملہ کرنے کے لئے گئی تھی اس میں سے صرف ۲۰ ہزار فرانس واپس آئی اور ۱۲۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا بار خزانہ پر پڑا۔

امریکہ کی خانہ جنگیوں (سنہ ۱۸۶۱-۱۸۶۵ء) میں ۴۰ لاکھ سپاہی شریک جنگ ہوئے، ان میں سے ۳ لاکھ سپاہی شمالی امریکہ کے ضایع ہوئے اور ۵ لاکھ جنوبی امریکہ کے۔ ان جنگوں کے مصارف کا اندازہ ۷۴ کرور پونڈ کیا جاتا ہے۔

جنگ کریمیا میں ۳۰۵۰۰۰۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار انگریزی سپاہ میں سے ۲۰ ہزار جان سے مارے گئے۔ شورش ہند (سنہ ۱۸۵۷ء) اور جنگ چین (سنہ ۱۸۶۰ء) میں ۵۲ ہزار آدمی ضایع ہوئے۔ فرانس و اطالیہ کی جنگ (سنہ ۱۸۵۹ء) میں، ۵۵ ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ آسٹریا اور پروشیا کی لڑائی میں (سنہ ۱۸۶۶ء) ۴ لاکھ سپاہی مقتول و مجروح ہوئے اور جنگ روس و ترکی میں (سنہ ۱۸۵۹ء) ۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار انسان ہلاک کئے گئے۔ فرانس اور پروشیا کی لڑائی میں (سنہ ۱۸۷۰ء) ۵ لاکھ آدمی کھیت رہے اور فرانس کو ۵۰ کرور ۶۰ لاکھ پونڈ کا نقصان ہوا۔ اسپین و امریکہ کی جنگ میں (سنہ ۱۸۹۸ء) امریکہ کا روزانہ خرچ ۵ کرور پونڈ اسپین کا ۲۵ ہزار پونڈ روزانہ تھا۔

جنگ عظیم کے مالی نقصانات

ڈاکٹر نکولس مرے بٹلر کا اندازہ ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم میں تقریباً ۸۰ ارب پونڈ صرف ہوئے۔ ایک کرور آدمی ہلاک اور دو کرور زخمی ہوئے۔ اسی سلسلہ میں ایک کرور آدمی انفلوئنزا کا شکار ہوئے جو اسی جنگ کی وجہ سے پھیلا تھا۔ اس جنگ میں ۷ کرور انسان ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔

اس جنگ کی وجہ سے جو اور نقصانات ہوئے، اس کا اندازہ کم از کم ۴۲ ارب پونڈ کیا جاتا ہے۔ دورانِ جنگ میں جرمنی کی تعداد پیدائش ۳۰ لاکھ کم ہو گئی اور صلح کے ۵ سال کے بعد تقریباً ۷۰ لاکھ فوجی پنشنیں وسطی یورپ کی حکومتوں کو جاری کرنا پڑیں۔

جب جنگ ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے اسٹور کی بچی ہوئی چیزوں کو فروخت کیا اور ۲۰ لاکھ خریداروں

کے ہاتھ ۶۶ کرور ۵۰ لاکھ پونڈ کا مال بیچا گیا۔

جنگ اطالیہ وحبشہ

۳۵ء اور ۳۶ء میں اطالیہ نے حبشہ کو کیا کیا بھیجا، اس کی فہرست ملاحظہ ہو:

سپاہی = ۲۵۰۰۰۰ — خیمہ کا کپڑا = ۵۲ ملین فٹ —
مختلف قسم کا کپڑا = ۶۲ ملین فٹ — گھوڑے اور خچر = ۸۷ ہزار — موٹر = ۱۳۵۰۰ —
مشین گن = ۱۱۵۰۰ — رائفل = ۴۵۰۰۰۰ — توپیں = ۸۰۰ — ٹینک = ۳۰۰ —
ٹیلی فون = ۵۵۰۰ — تار ۲۰ ہزار میل لمبا — لاسلکی سٹ = ۱۰۸۱ — ۶۲۷ جہازوں سے اٹلی نے ایک ہزار ٹن وزن کے بم گرائے اور ۱۵۵۰۰۰ راؤنڈ کارتوس مشین گنوں سے چلائے گئے۔

دول عظمیٰ کی فوجی طاقت

برطانیہ:- یکم جنوری ۳۸ء کو برطانیہ کی فوجی طاقت ۵ لاکھ تھی، اور رزرو کو ملا کر ۶۲۱۰۰۰ - ہندوستان میں ۲۱۰۰۰۰ فوج تھی جس میں تقریباً ۱۵۵۰۰۰ ہندوستانی فوج بھی شامل ہے۔

ہوائی فوج ۶۲۹۰۰ تھی اور جہازوں کی تعداد پندرہ اور سترہ سو کے درمیان تھی۔ ۳۹ء میں اس قوت کو ۲۸۶۰ جہازوں تک پہونچانے کا پروگرام بنایا گیا جو غالباً پورا نہیں ہو سکا۔ بحری فوج کی تعداد ۱۲۰۰۰۰ تھی، رزرو فوج (۶۰۰۰۰) اس کے علاوہ تھی۔ جہازوں کی تعداد ۲۸۰ تھی جن میں پندرہ بڑے جنگی جہاز، چھ ہوائی جہازوں کو اٹھانے والے، ۴۵ کروزر، ۱۵۳ تباہ کن جہاز اور ۵۲ آبدوز جہاز تھے۔ توپوں کی تعداد ۱۲۲۵ اور تارپیڈو ٹیوب کی ۱۰۰۹ تھی، ۷۵ جہاز اور زیر تعمیر تھے۔

برطانیہ کا فوجی بجٹ ۳۴ء میں ۳۹۵۰۰۰۰۰ پونڈ تھا۔ ۳۸ء میں اس کی مقدار ۱۲۲۳۳۰۰۰ پونڈ ہو گئی اور ۳۹ء کے لئے ۲۲۷۰۰۰۰۰ پونڈ رکھے گئے ہیں۔ فوجی پنشن کے مصارف اس کے علاوہ ہیں جس کا اندازہ ۳۹ء کے لئے ۵۸۰۰۰۰۰ پونڈ ہے۔ ۳۷ء میں خزانہ کو ۴۰ کرور پونڈ قرض لینے کی اجازت دی گئی تاکہ اس رقم سے ۴۲ء تک مدافعت کی اسکیم کو بروئے کار لایا جائے۔

فرانس:- فرانس کی فوجی طاقت ۳۷ء میں ۶۹۲۸۶۰ تھی۔ اس میں سے ۴۸۶۰۰۰ سپاہی فرانس کے لئے مخصوص تھے، ۱۵۸۰۰۰ الجزائر کے لئے، ۴۸۰۰۰ مراکش کے لئے، ۱۲۰۰۰ تیونس کے لئے اور ۶۰ ہزار نو آبادیوں کے لئے۔

ہوائی فوج کی تعداد ۳۸ء میں ۶۲۰۰۰ تھی۔ جہازوں کی تعداد ظاہر نہیں کی گئی۔ ہوائی بجٹ ۳۹ء میں بجائے دو کرور کے ۶ کرور پونڈ کر دیا گیا۔ ۳۸ء میں جہازوں کے مصارف طیاری کا اوسط سترہ ہزار پونڈ فی جہاز تھا اور حکومت نے یہ تجویز کی تھی کہ ۳۹ء میں ہر ماہ ۵۰۰ جہاز طیار کئے جائیں۔

بحری فوج ۳۶ء میں ۱۵۷۰۰۰ تھی، اس کے دو سال بعد یہ تعداد ۵۵۲۰۰۰ ہو گئی، جہازوں کی

تعداد ۴۷ ا تھی۔ سنہ ۳۹ء میں ۱۳۰ جہاز اور طیار کئے جائیں گے۔

جرمنی :۔ سنہ ۱۳ء میں جرمنی کی مستقل فوج ۸ لاکھ سپاہ اور ۱۰ لاکھ ٹن کے جہازوں پر مشتمل تھی۔ ان پر ۷ کروڑ پونڈ سالانہ صرف ہوتا تھا۔ سنہ ۱۹ء میں معاہدۂ ورسائی کی رو سے اس کے پاس صرف ایک لاکھ فوج اور ۵۰۰۰۰ ٹن کے جہاز رہ گئے جن پر ۳۰۵۰۰۰۰ پونڈ صرف کرتا تھا۔ لیکن ہٹلر کی حکومت نے اس معاہدہ کو توڑ کر اپنی فوجی قوت کو بڑھانا شروع کیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسوقت واقعی قوت اس کی کیا ہے، تاہم عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سوائے روس کے اور سب ملکوں سے زیادہ فوج اس کے پاس ہے۔

روس :۔ روس کی آبادی ۱۸ کروڑ ہے اور اس کی فوجی طاقت بڑی زبردست ہے، سنہ ۳۶ء میں اس کی فوجی قوت ۱۳ لاکھ تھی، لیکن اس کے بعد اس وقت تک ۵۲ لاکھ سے زیادہ آدمی فوجی تعلیم حاصل کر چکے ہیں اس کی ہوائی طاقت سنہ ۳۲ء میں ۷۵۰ جہازوں پر مشتمل تھی، اس کے پانچ سال بعد یہ پانچ گنی ہو گئی۔

امریکہ :۔ سنہ ۳۸ء میں امریکہ کی بری فوج ۱۸۰۰۰۰ تھی اور ہوائی ۱۸۷۴۲۔ علاوہ اس مستقل فوج کے رزرو فوج بھی ہے اور اس طرح سب کو ملا کر اس کی قوت ۴۸۵۰۰۰ تھی۔

بحری قوت کے لحاظ سے وہ دنیا کی دوسری قوت مانی جاتی ہے۔ اسوقت ۳۴۳ مسلح جہاز اس کے پاس موجود ہیں اور ۸۳ طیار ہو رہے ہیں۔ ان جہازوں میں ۲۰۰۰ توپیں اور ۲۲۵۰ تارپیڈو ٹیوب نصب ہیں۔ اس کے ۴۱۷ جہازوں میں سے (جن میں سے ۸۳ زیر طیاری ہیں) ۱۷ بڑے جنگی جہاز، ۲۵۱ تباہ کن جہاز، ۱۰۶ آبدوز، ۳۷ کروزر اور چھ طیارہ بردار جہاز ہیں۔ بحری فوج کی تعداد ۱۱۵۰۰۰ ہے۔

جاپان :۔ سنہ ۳۶ء میں جاپان کے پاس ۲۵۰۰۰۰ فوج تھی، لیکن جولائی سنہ ۳۸ء میں اسکے دس لاکھ سپاہی چین میں کام کر رہے تھے۔ اس کی ہوائی قوت کا اندازہ چار ہزار جہاز کیا جاتا ہے۔ سنہ ۳۷ء میں اس کی بحری قوت ۲۴۲ جہازوں پر مشتمل تھی لیکن اب اور زیادہ ہو گئی ہے۔

اطالیہ :۔ اطالیہ کی بری فوج کا اندازہ پانچ لاکھ ہے، لیکن حبشہ اور اسپین کی جنگوں کی وجہ سے اس میں اضافہ کرنا پڑا تھا۔ اس کی ہوائی قوت سنہ ۳۴ء میں ۱۸۶۰ جہاز تھی لیکن اب بہت بڑھ گئی ہے۔ سنہ ۳۹ء میں اسکی بحری قوت ۲۰۲ جہازوں پر مشتمل تھی، جن میں چھ بڑے جنگی جہاز ہیں، ۲۲ کروزر ہیں، ۱۳۸ تباہ کن جہاز اور ۱۰۵ آبدوز۔

مصارفِ آراستگی فوج

سنہ ۳۲ء میں فوج کے مصارفِ آراستگی پندرہ ملکوں میں بڑھ گئے، چھ میں اپنے حال پر قائم رہے اور ۳۰ ملکوں میں کم ہو گئے۔ سنہ ۳۵ء میں یہ تعداد علی الترتیب ۴۱ دو اور پندرہ ہو گئی اور سنہ ۳۸ء میں ۴۹۔ ایک اور آٹھ۔

سنہ ۳۲ء میں دنیا نے آراستگی افواج پر تقریباً ۱۴۵۴...... پونڈ صرف کئے اور سنہ ۳۶ء میں یہ رقم ۲۴۴...... پونڈ تک پہونچ گئی۔

سنہ ۳۲ء میں فوجی مصارف یورپ کی آمدنی کے ۲۰ فی صدی تھے اور اب ۶۲ فی صدی ہیں۔

سنہ ۳۲ء اور سنہ ۳۶ء کے درمیان برطانیہ کے فوجی مصارف تگنے ہوگئے ہیں۔ روس کے مصارف ۱۴۱۲۳...... روبل سے ۲۰۱۰۲۲...... روبل تک پہونچ گئے، گویا ۱۵۰۰ فی صدی کا اضافہ ہوگیا۔ فرانس میں کم ہوگئے لیکن جاپان، اٹلی، جرمنی اور امریکہ میں بہت بڑھ گئے۔

امریکہ میں سنہ ۳۲ء کا فوجی بجٹ ۱۳۰...... پونڈ تھا لیکن سنہ ۳۸ء میں ۲۰...... پونڈ ہوگیا۔

مصارف فی کس

سنہ ۳۸ء میں فوج کا سالانہ خرچ تمام آبادی پر پھیلانے سے یوں پڑتا تھا:-

جرمنی = ۱۲ پونڈ — برطانیہ = ۷ پونڈ — روس = ۶ پونڈ — فرانس و جاپان = ۵ پونڈ — اطالیہ = ۳ پونڈ — امریکہ = ۲ پونڈ۔

سنہ ۱۳ء سے سنہ ۳۸ء تک یورپین اقوام کے مصارف فوج جتنے بڑھ گئے ہیں اس کا اندازہ ذیل کے نقشے سے ہوسکتا ہے:-

	سنہ ۱۳ء	سنہ ۳۸ء
روس	۵ فی صدی	۲۲ فی صدی
جرمنی	۴ "	۱۵ "
فرانس	۶ "	۱۰ "
اطالیہ	۳ "	۹ "
برطانیہ	۵ "	۷ "

گزشتہ جنگ سے پہلے ۲۵ سال کے اندر تمام دول یورپ کے مصارف کی مقدار ۶ ارب ۱۰ کروڑ پونڈ تھی جو جنگ عظیم کے مصارف کا پانچواں حصہ ہے اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ لڑائی کیا چیز ہے اور دنیا کی خوشحالی پر اس کے اثرات کتنے ہولناک ہوتے ہیں۔

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عه ر- رعایتی ۱۲ ار- علاوہ محصول۔

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مثنوی زہرِ عشق پر ایک نظر

اُنیسویں صدی کی معاشرت و معیشت کی داستان ہماری قومی تاریخ کا سب سے رنگین لیکن ساتھ ہی ساتھ سب سے افسوسناک باب ہے۔ زندگی "سکرِ دوام" میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہر شخص یک گونہ بیخودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ باغوں کے جلسے، برساتوں کے میلے، حسینوں کے جمگھٹے، شعر و شراب و شباب کی رنگینیاں، رقص و سرود کی محفلیں، غرض ایک ہنگامہ نشر و طرب تھا کہ ہر طرف برپا تھا۔ اور خوب دل کھول کر دادِ عشرت دی جا رہی تھی، لکھنؤ اس بدمستی کا گہوارہ تھا، جانِ عالم پیا کی عشرت گاہ پرستان بن گئی تھی۔ غزالہ آہو، کرشن لیلا اور اندر سبھا کے تماشے ہوتے تھے۔ ساون کی مست پریوں کے گانے، باغوں کے جھولے، قیصر باغ میں دو کیڑے بھی۔ تگے، جوگن بھی بنی، در در پھری، سیاں کیلئے کی تانیں ۔۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام لکھنؤ جھوم رہا ہے، ہیئت کا نظام بدل گیا ہے اور روز و شب کی رنگینیاں قائم ہو کر رہ گئی ہیں۔

اس زمانہ کی معاشرت کے اگر تمام خد و خال کو ملاحظہ کرنا ہے تو ہمیں اس زمانہ کا لٹریچر دیکھنا چاہیئے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت کسی جگہ اس قدر واضح اور روشن نہیں ہے جتنی کہ اس معاملہ میں، اس میں ہمیں زیور و ملبوس، رسوم و آداب، عرسوں کی دھوم دھام، تکلف و تصنع، ظاہر داری، نسوانیت، سامانِ عیش و آرائش اور طرزِ گفتگو کی جیتی جاگتی تصویریں ملیں گی۔ اخترِ نگر کے شباب کے افسانے، رتجگے کے سامان، وصل کی داستانیں، غرض سب ہی کچھ نظر آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اس محبت خیز و عشق ریز سرزمین میں شعر و سخن کو کتنا دخل ہو گا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مشاعرہ کی یہ صحبتیں معاشرت کا جزو بن گئی تھیں۔ لکھنؤ رشکِ شیراز و صفاہان بنا ہوا تھا۔ یہ زمانہ ایک طریقہ سے ہمارے عروج کا بھی تھا اور زوال کا بھی۔ فنونِ لطیفہ کے حصول کے لئے جس جوش و خروش کا اظہار اس زمانہ میں ہوا، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہر شخص شاعر تھا اور اگر شاعر نہیں تھا تو شعر و سخن میں دخل ضرور رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اسی زمانہ میں ہمارے معاشرہ پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا، اسی وجہ سے اسی زمانہ کے بیشتر کلام میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے۔ اس زمانہ کی شاعری تمامتر اجتماعی مفروضات اور معاشرتی میلانات کی مظہر ہے۔ وہی تکلف و تصنع، نسوانیت اور اخلاقی فرو مایگی جو سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہی تھی، شاعری میں سب جلوہ گر ہے۔ نکتہ آفرینی، دقت پسندی، رعایتِ لفظی، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی فراوانی کا نام شاعری ہو کر رہ گیا۔ آوارگی اور ہوسناکی عشق کی مترادف سمجھی جانے لگی۔ اسی لئے

شاعری نے بھی جامہ عریانی اختیار کرلیا۔ بے پردہ مضامین، مبتذل الفاظ، سوقیانہ محاورے اور انگیا چوٹی کا ذکر شعر و سخن کی جان ہوگیا۔ یوں سمجھئے کہ انشا اور ان کے ساتھیوں نے جو کام شروع کیا تھا وہ مکمل ہوگیا۔ اور "اختر سیاں" کی فضا نے اس رنگ کو ایسا اُچھالا کہ بقول شخصے ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی کیہ بات ہوگئی۔ اُس زمانہ کی شاعری کا رنگ یہ تھا:-

چشم بد دور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف
سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

تصور میں ہے ایک انگیا کی چڑیا
یہ دل گنجشک کا اب آشیاں ہے

کھولئے شوق سے بند انگیا کے
لیٹ کے ساتھ نہ شرمائیے آپ

نہ دوپٹے کو آگے سے دہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

حیرت ہوتی ہے کہ اس فضا میں انیس، دبیر اور مرزا شوق نے زبان اور بیان کے کیسے کارنامے دکھلائے، نواب مرزا شوق کا نام سُنکر کچھ لوگ چونکیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا نام بھی انھیں لوگوں میں شمار کرنا پڑتا ہے جنھوں نے "لسانی معصیت" کی تلافی میں حصہ لیا ہے اور زمانہ کی روش سے ہٹ کر بالکل صاف اور شگفتہ زبان اختیار کی ہے۔

ہماری پچھلی تنقیدوں کے معیار بھی عجیب و غریب تھے۔ مثنوی زہر عشق کی طرف لوگوں نے محض اس وجہ سے توجہ نہیں کی کہ وہ ان کے اخلاقی معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی۔ اس بیسویں صدی میں ہماری زندگی کے گوشہ گوشہ میں انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ ادب کے جانچنے کی بھی نئی کسوٹیاں پیدا ہوگئی ہیں، اب تنقید کا وہ عام معیار نہیں رہا کہ یہ چیز اخلاقی اعتبار سے اچھی ہے یا بری بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اچھی لکھی گئی ہے یا بری۔ اسی طرح اگر مثنوی کو اسکے صحیح پس منظر کے ساتھ جانچا جائے تو مرزا شوق نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ ایک فن کار کی حیثیت سے بھی نظر آئیں گے لیکن اُس کے لئے ضروری ہے کہ ہم عالم مثال کی ماورائی فضا سے نیچے اُتر کر اسی عالم آب و گل کی سیر کریں جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور جیتے ہیں۔

نواب مرزا شوق، المنصور سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہمعصر اور آتش مرحوم کے شاگرد تھے۔ ان کا اصلی نام حکیم تصدق حسین خاں تھا۔ نواب مرزا عرف اور شوق تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام مرزا آغا علی خاں لکھنوی تھا اسوقت لکھنؤ کی تمام فضا شاعر گر بنی ہوئی تھی۔ مرزا شوق بڑی موزوں طبیعت رکھتے تھے، لکھنؤ کے ہوائی اثر نے اس ذوق کو اور جلا دی۔ بہت سی غزلیں لکھیں اور غالباً ایک کلیات بھی مرتب کیا ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ مثنوی زہر عشق ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی مثنویاں بہار عشق، فریب عشق، لذت عشق لکھیں، لیکن جو رتبہ اور مقبولیت زہر عشق کو حاصل ہو وہ کسی کو نصیب نہیں زہر عشق کا قصہ جو آپ بیتی کے طور پر لکھا گیا ہے، بہت ہی سادہ ہے۔ شوق ہی میر افسانہ ہیں اور محلہ کے

ایک عالی خاندان سوداگر کی اکلوتی اور کنواری بیٹی ہیروئن۔ شوق اس سوداگر کے بارے میں لکھتے ہیں :-

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر   وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
مرد اشراف، صاحب دولت   تاجروں میں کمال ذی عزت
غم نہ تھا کچھ فراغ بالی سے   تھا بہت خاندان عالی سے

اس کے بعد اس کی "خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر" لڑکی کی تعریف کرتے ہیں :-

ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں،   شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں،   غیرتِ حور تھی حقیقت میں،
سبزۂ نخلِ گلِ جوانی تھا   حُسنِ یوسف فقط کہانی تھا
رخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی،   جو ادا اس کی تھی قیامت تھی،

سوداگر کی بیٹی چال ڈھال کی نستعلیق، خوبصورت اور بلا کی جامہ زیب واقع ہوئی تھی۔ وہ والدین کی چہیتی بیٹی اور گھر کی چشم و چراغ تھی۔ اس لئے سارا گھر اس پر قربان رہتا تھا۔ اسے لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا اور شعر و سخن سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ جوانی اور شاعری، کسی لڑکی کا خمیر حیات ہو جائے تو وہ مرد کے لئے بڑی قیامت خیز ہو جاتی ہے چنانچہ "مرزا" اور سوداگر کی بیٹی ایک ہی نظر میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ عشق کی ابتدا اور اس کا پس منظر بڑا دلچسپ اور مناسب ہے اس نے واقعیت اور نفسیاتی کیفیت کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

ایک دن چرخ پر جو ابر آیا،   کچھ اندھیرا سا ہر طرف چھایا
کھل گیا جب برس کے وہ بادل   قوس تب آسماں پر آئی نکل،
دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا   سیر کرنے کو بام پر آیا،

ہیرو ادھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک طرف نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے کہ "دخت سوداگر" باصد رعنائی اپنی ہمجولیوں کے ساتھ موسم کا لطف اُٹھا رہی ہے :-

دیکھا اک سمت جو اُٹھا کے نظر   سامنے تھی وہ دخت سوداگر
ساتھ ہمجولیاں بھی تھیں دو چار،   دیکھتی تھیں وہ آسماں کی بہار
بام سے کچھ اُترتی جاتی تھیں،   چہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں،

اتنے میں وہ "گل رو" اکیلی رہ جاتی ہے اور سیر کرنے میں دونوں کی نگاہیں چار ہو جاتی ہیں۔ واہ کے ساتھ اندر سے آہ بھی نکلتی ہے اور حسن و عشق دونوں بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ مرزا نے ہیرو کی محویت کا عالم

اس طرح بیان کیا ہے :-

سامنے وہ کھڑی تھی ماہ منیر　　چپ کھڑا تھا میں صورتِ تصویر
دیکھتا اس کو بار بار تھا میں　　محو حسن جمال یار تھا میں

اسی بے اختیاری کے عالم میں ایک کنیز آکر لڑکی کو یہ پیام دیتی ہے :-

بیٹھی ناحق بھی ہوئیں کھاتی ہیں،　　اماں جان آپ کی بلاتی ہیں،
گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں　　چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں

لڑکی چلی جاتی ہے، اس کے بعد میرو بھی رنج و غم سے لبریز، مجبوری کے عالم میں کوٹھے سے اتر آتا ہے - یہ معمولی واقعہ ان دونوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور نظروں کا وہ 'کیفِ تصادم' جتنا بھلایا جاتا ہے اتنا ہی اور یاد آتا ہے :-

شام سے پھر سحر کی مر مر کے　　شب وہ کاٹی خدا خدا کر کے
پڑ گیا دل میں غم سے اک ناسور　　یہی اس دن سے پڑ گیا دستور
دن میں سو بار بام پر جانا　　دیکھنا بھالنا، چلے آنا،

لیکن اس لڑکی کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی - میر افسانہ کا رنج و غم کی وجہ سے برا حال ہو گیا - چہرہ کی رنگت بدل گئی - اور بیماروں سے بدتر حال ہو گیا - آخر شفیق ماں جس نے بیٹے کی بڑے ناز و نعم سے پرورش کی تھی، دریافت کیا کہ یہ کیا وجہ ہے کہ :-

کھاتے ہو، پیتے ہو، نہ سوتے ہو　　روز اٹھ اٹھ کے شب کو روتے ہو
اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں،　　آپ، آفت میں جان کو ڈالیں
تیرے پیچھے کی تلخ سب اوقات　　دن کو دن سمجھی اور نہ رات کو رات
پالا کس کس طرح نہیں جانی　　کون منت تھی جو نہیں مانی
روشنی مسجدوں میں کرتی تھی　　جا کے درگاہ، چوکی بھرتی تھی
اب جو نام خدا جوان ہوئے　　ایسے مختار میری جان ہوئے

"دخترِ سوداگر" کی جراحتیں بھی حد کو پہونچ چکی تھیں :-

موج الفت اسے ڈبونے لگی　　ایک الجھن سی دل کو ہونے لگی
گھٹنے طاقت لگی جو روز بروز　　آتش ہجر ہو گئی دل سوز
داغ جوں جوں جگر کے جلتے تھے　　اشک گرم آنکھ سے نکلتے تھے

ہوگئی جب کمال حالتِ زار　　　شب کو رہنے لگا اسے بھی بخار

آخر اس کا دل شدتِ تمنا سے ٹوٹنے لگا۔ صبر و شکیب نے اس کا ساتھ چھوڑا اور عقل نے "پاسبانی" ترک کردی اس نے مجبور ہوکر اپنی ماما کے ہاتھ ایک مختصر سا خط بھیجا۔ ہیرو نے بڑے جوش سے اس محبت کی پذیرائی کی اور جواب میں نامہ شوق لکھا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا جواب نہایت دلچسپ آیا جس کے نقطہ لفظ سے احتراز واجتناب اور غیرت وحمیت ٹپکتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور پیار و محبت میں وقت گزرنے لگا لیکن اس دنیا میں کسی چیز کو استحکام نہیں ہے۔ مسرت کی عمریں بھی مختصر ہوتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا وقت بھی گزرا لڑکی کے والدین کو اس راز کا علم ہوگیا۔ اس کی نگرانی کی جانے لگی اور یہ تجویز ہوئی کہ اس کو بنارس بھیج دیا جائے دو مہینے تک ان لوگوں کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ بڑی مصیبت سے وقت گزرتا ہے لیکن ایک رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے محبوب کے پاس پہونچ جاتی ہے اور جملہ حالات اور اپنے روح فرسا ارادہ سے مطلع کرتی ہے۔ یہ اس کی آخری ملاقات ہے اور زندگی کی آخری شب۔ صبح کو وہ کچھ ہوجاتا ہے جو ہمارا جی چاہتا ہے کہ کبھی نہ ہوا ہوتا۔ وہ عشق کی سرکار میں نقدِ جاں نذر کردیتی ہے اور اس کے بعد تقریباً قصہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ عاشق اپنی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکامیاب رہتا ہے اور سخت جانی کے ساتھ زندہ رہنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

یہ ایک پرخلوص محبت کی سادی سی داستان ہے۔ جو بہت سادہ انداز میں بیان کردی گئی ہے اسی لئے اس میں سوز و اثر کی نمایاں کیفیت اور جذبات کا اظہار پورے طور پر موجود ہے۔ اس زبان میں مصنوعیت قطعاً نہیں ہے۔ بے تکلفی سادگی اور نغمگی اس کی بڑی خصوصیات ہیں، شوق نے عورتوں کی زبان کا بھی حق ادا کردیا ہے۔ انھوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے لیکن یہ رنگ اُن کے یہاں اسی حد تک ہے جیسا کہ بقول آزاد آنکھوں میں سرمہ اور چہرہ پر غازہ، اعتدال سے نہیں گزرے ہیں اور اسی لئے تاثیر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ شوق کے یہاں واقعیت (Realism) اور حسیت (Sensuousness) کا کمال نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی مثنوی غیر معمولی اثرات کی حامل ہے۔ ہمیں تمام مثنوی میں ایک جگہ بھی ایسی نہیں ملتی جہاں شوق اثرانگیزی میں ناکام رہے ہوں وہ کوئی ایسی چیز بیان ہی نہیں کرتے جو قدرت کے مسلمات کے خلاف ہو یا فطرت کے اُصولوں سے متصادم نظر آتی ہو۔ ان کی زبان سادہ، بامحاورہ اور پر اثر ہے تشبیہیں اور استعارے قریب الماخذ ہیں، واقعات ایسے ہیں جو اس دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کے کردار بالکل اسی دنیا کے انسان ہیں، جن میں خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ اچھائیاں بھی اور برائیاں بھی۔ لیکن اُن میں سے ہر ایک ہماری ہمدردیاں حاصل کرتا ہے اور ہم بہت خوشی کے ساتھ اس کی ہر اچھی بری بات میں شریک رہتے ہیں۔

شوق کی مثنوی زہر عشق کے بارے، میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ان کا اپنا واقعہ ہے جس کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اُن کے حالات زیادہ نہیں معلوم اس لئے اس سلسلہ میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی لیکن شوق نے آپ بیتی کا رنگ اختیار کر کے قصہ کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں اس پر واقعہ کا شبہ ہونے لگتا ہے اور یہ ایک فنکار کا بڑا کمال ہے۔ شوق کے کردار ایسے نہیں ہیں جو اس عالم کی چیز نہ معلوم ہوتے ہوں۔ اس کی ہیروئن ایک شریف سوداگر کی بیٹی ہے اور اس کی سوسائٹی میں وہی پوزیشن ہے جو ہیرو کی۔ دونوں ایک محلہ میں رہتے ہیں۔ پھر عشق کی اس داستان سرگشتگی کی جہاں ابتدا ہوتی ہے وہ کوئی جنگل، پرستان، کنج باغ، یا دریا کا کنارہ نہیں ہے۔ وہ صرف مکان کی چھت ہے۔ جو لکھنؤ کے ایک گوشہ میں واقع ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا اصلیت کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ عشق کی یہ ابتدا بہت سادہ ہے۔ اودھ کی شام ہے پانی برس کر ابھی ابھی کھلا ہے۔ قوس قزح نکل آئی ہے۔ سوداگر کی لڑکی اپنے تمام ملکوتی جمال کے ساتھ موسم کا لطف اُٹھا رہی ہے۔ ایسے میں ہیرو کی نظریں جو اپنا دل بہلانے کے لئے اوپر چلا آیا ہے، لڑکی پر پڑتی ہیں، اور نگاہوں نگاہوں میں دل کا سودا ہو جاتا ہے۔ یہ بات غیر معمولی ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ان لوگوں کی مراسلت، اور ملاقات بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتبار نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام قصہ میں صرف دو جگہیں ایسی ہیں۔ جہاں "ناممکن" کا گمان ہوتا ہے یا اگر ایسا نہیں تو طبیعت میں شک اور شبہ ضرور، پیدا ہوتا ہے۔ ماں اور بیٹے کی گفتگو بڑی حیرت انگیز ہے۔ اپنے چہیتے بیٹے کی حالت پر ماں کا پریشان ہونا، بالکل بجا اور درست ہے لیکن اُنیسویں، صدی میں اور وہ بھی لکھنؤ کے اندر جہاں کہ شریف گھرانوں میں اخلاق و آداب انتہا سے زیادہ برتے جاتے تھے، یہ بات ذرا انوکھی معلوم ہوتی ہے کہ ماں، بیٹے سے یہ سوال کرے:-

رنج کس شعلہ رو کا کھاتے ہو — شمع کی طرح سے پگھلے جاتے ہو
کون سی ماہرو پہ مرتے ہو — سچ کہو کس کو پیار کرتے ہو
یہ کہو مہ جبیں ملا ہے کون ؟ — تم کو ایسا حسیں ملا ہے کون؟

یہ سوالات اگر کسی دوست کی زبانی ہوتے تو زیادہ اچھے معلوم ہوتے۔ لیکن ماں کی محبت باؤلی ہوتی ہے۔ شاید عزیز بیٹے کا بُرا حال دیکھ کر یہ سوالات بھی کر بیٹھی ہو۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں یہ "مرض" بہت عام تھا۔ مگر باوجود اس کے پرانے خاندان اور شریف گھرانے کا خیال کر کے اس چیز کے باور کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ اسی طرح مثنوی کا اختتام بھی فن کے اعتبار سے کچھ اچھا نہیں ہے۔ آخر میں ایک دم سے جذباتی دلکشی (Emotional Appeal) کم ہو جاتی ہے۔ عاشق محبوب کے مرنے کے بعد قبر پہ آہ و زاری کرتا ہے۔ پھر گھر آ کر زہر کھا لیتا ہے، لیکن عجیب و غریب طریقہ سے بچ جاتا ہے۔ قصہ کا خاتمہ بہت عجلت کے ساتھ کیا گیا ہے اور

اس میں کوئی خاص سلیقہ نہیں برتا گیا۔ پلاٹ کے اور واقعات کے ساتھ ساتھ اختتام بھی سادہ ہے لیکن اس سے صناعانہ تکمیل کا پتہ نہیں چلتا۔ برنارڈ شاہ نے اپنے حزنیہ "سینٹ جون" میں انگریز پادری کا کردار بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور آخر میں جذباتی دلکشی کو اور بڑھا دیا ہے۔ وہ اب تک جون کے خون کا پیاسا تھا، لیکن آخر میں اس کا ضمیر بغاوت کرتا ہے اور وہ یہ کہہ اٹھتا ہے:۔ "مسیح! مسیح، میرے حال پر رحم کر، وہ تیری آغوش میں ہے اور میں — ہمیشہ کے جہنم میں —" مثنوی کے ہیرو اور پادری کے کیرکٹر میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن پھر بھی "دیکھا آنکھوں سے تھا جو ایسا قہر" کے بعد ہم زہر اور اس سے بچ جانے کے معمولی نتائج سے زیادہ کوئی اہم اور موثر اختتام چاہتے ہیں۔ مثنوی کا جو اختتام ہے اس کے جواز میں اگر کوئی بات کہی جا سکتی ہے تو صرف یہ کہ ہیروئن کی وصیت اس کے ترتیب دینے میں بڑی امداد دیتی ہے اور ہیرو اسی کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تیسرا اعتراض جو مثنوی پر ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس کی ساری داستان صرف ہیروئن کے کردار پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کیرکٹر اتنا دلچسپ نہیں معلوم ہوتا۔ قصہ میں تنوع بھی نہیں ہے۔ اور مسلسل یکسانی کو دور کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ لیکن قصہ کے اختصار نے اس نقص کو بڑی حد تک چھپا لیا ہے۔

مثنوی کا قصہ بہت مختصر اور سادہ ہے اسی لئے اس میں زیادہ اشخاص نظر نہیں آتے۔ اس میں ہیرو، ہیروئن دونوں کی مائیں اور ایک کنیز کو پیش کیا گیا ہے لیکن ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ اور کوئی کچھ کام نہیں کرتا۔ میر افسانہ کی ماں، بیٹے کی حالت پر مضطرب ہے اور ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کے ساتھ اس سے چند سوالات کرتی ہے لڑکی کی ماں روتی ہوئی اور پریشان دکھلائی گئی ہے اس کی کیفیت بالکل موقع کے مناسب ہے یہی وجہ ہے کہ قاری اس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کنیز تمام قصہ میں صرف ایک جملہ زبان سے نکالتی ہے:۔

"چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں"

میر افسانہ کا کردار کسی نمایاں خصوصیت کا حامل نہیں ہے بلکہ اگر بامعان نظر دیکھا جائے تو اس میں چند ایسی خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے مثنوی ختم کرنے کے بعد اس سے کوئی خاص ہمدردی نہیں پیدا ہوتی۔ اس کی کچھ باتیں ہمارے اوپر بہت برا اثر چھوڑ جاتی ہیں اور بعض تو پہلی نظر میں بالکل ناقابل معافی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ شروع ہی سے کچھ دلگیر، مستغرق، اور مجہول قسم کا انسان نظر آتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اس سے کوئی عمل (Action) سرزد نہیں ہوتا۔ ہر چیز کی ابتدا ہیروئن کی طرف سے ہوتی ہے۔ مرزا نے عاشق کی حالت ہجر بہت تفصیل سے دکھلائی ہے اور بتلایا ہے کہ اس کا حال بالکل بیماروں کا سا ہو گیا تھا۔ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ ہر وقت روتے ہی گزرتی تھی لیکن اس عرصہ میں وہ کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کی ہمت اور عمل کا ثبوت ملے اس وقت بھی ہیروئن ہی مستعدی سے کام کرتی ہے۔ ممکن ہے اسے موقعے حاصل ہوں لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا

ہیروئن اسے خط بھیجتی ہے۔ ہیرو اس کا جواب دیتا ہے اور اس میں اپنی محبت کو ثابت کرنا چاہتا ہے لیکن اسکے "عدم عمل" کے مقابلہ پر یہ فقرے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے :-

خوب لی آپ نے خبر میری بن گئی یاں تو جان پر میری
اب بھی پوچھا تو مہربانی کی ہجر میں مر کے زندگانی کی

وہ اپنے صبر و ضبط اور خودداری کا ثبوت اس طرح دیتا ہے :-

پر خبر کی نہ اپنی حالت سے مر گئے ہم تو رنج فرقت سے

لیکن آگے کے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ خودداری نہیں بلکہ بے عملی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اسوقت ملتا ہے جب لڑکی دو مہینے تک نہیں آتی اور وہ اس کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ ایسے سخت موقع پر وہ محبت کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود صرف اتنا سوچ کر رہ جاتا ہے :-

کس کو بھیجوں مکان پر اس کے کون ایسا ہے جائے گھر اس کے

اسوقت بھی ہیروئن ہی مستعدی کے ساتھ کام کرتی ہے اور ہیرو اشکباری سے زیادہ اور کسی چیز سے اپنی محبت کا ثبوت نہیں دیتا۔ "آخری منظر" میں اس کا عدم عمل (Inaction) قاری کے لئے بالکل ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ محبوب کو اپنے مہلک ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کوئی موثر اقدام نہیں کرتا۔ وہ صرف منع کرتا ہے اور وہ بھی کچھ ایسے انداز میں جو موقع کی نزاکت اور اہمیت کے لحاظ سے قطعاً موزوں نہیں ہے۔ کہتا ہے :-

پہونچا ماں باپ سے اگر ہے الم اس کا کرنا نہ چاہئے تمھیں غم
صدمہ ہر ایک پہ گزرتا ہے زہر کھا کے بھی کوئی مرتا ہے
شکوہ ماں باپ کا تو ناحق ہے ان کا اولاد پر بڑا حق ہے
ہوں جو ناراض یہ قیامت ہے اُن کے قدموں کے نیچے جنت ہے
تم تو نام خدا سے ہو دانا اس پہ رتبہ نہ ان کا پہچانا
غور سے کیجئے جو دل میں خیال، اُن کا غصّہ نہیں ہے جائے ملال

عاشق محبوب کی دشواری کو کسی طرح حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی نہ کوئی امداد کرتا ہے اور نہ اسے کوئی مشورہ دیتا ہے۔ اس کی مجہولیت اور بے عملی کا سب سے افسوسناک ثبوت شاید اسی شعر میں مضمر ہے :-

جو کہا ہے وہی نہ کر بیٹھے کون روکے گا جاکے گھر بیٹھے

اور اس کے تساہل اور عدم عمل کا شاید اس سے زیادہ صحیح مرقع مثنوی بھر میں نہیں مل سکتا :-

ہر گھڑی تھا جو اضطراب فزوں چپکا روتا تھا بیٹھا میں محزوں

اس کے بعد ہی شور ماتم اٹھتا ہے اور محبوبہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے۔

ان تمام واقعات کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ عاشق صحیح معنوں میں محبت نہیں کرتا بلکہ اسکا مطمح نظر صرف بوالہوسی ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ مثنوی میں اس کا پورا ثبوت موجود ہے کہ اسے محبوبہ سے محبت ہے اس کی ہر تکلیف سے آزردہ ہوتا ہے۔ ہجر میں اس کی حالت بالکل غیر ہوجاتی ہے وہ پہچانا نہیں جاتا۔ لوگ اسے دیکھ کر مہینوں کا بیمار سمجھتے ہیں۔ آخری ملاقات میں اس کی اشکباری اور آزردگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ محبوبہ کی تسلی کے الفاظ بھی اس کے لئے ناکافی ثابت ہوتے ہیں:۔

رو نہ اس طرح سے تو زار وقطار دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار

آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں، اور لینے کے دینے پڑ جائیں

میں ابھی تو نہیں گئی ہوں مر کیوں سجائی ہیں آنکھیں رو رو کر

ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں یوں کہیں مرد بھی روتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ مرزا شوق نے ہیرو کو بالکل معمولی انسان کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ ان کی حقیقت پسندی کا بڑا ثبوت ہے۔ ہیرو غیر معمولی خصوصیات کا حامل نہیں ہے بلکہ اوسط درجہ کا ایک شخص ہے جس سے ہمیں زندگی میں روز سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے افراد میں عملیت سے زیادہ جذباتیت بھری ہوئی تھی اور لوگ تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قایل تھے۔ شوق کا ہیرو بڑی حد تک زمانہ کا نمونہ ہے۔ وہ خطرات کا عادی نہیں ہے اور مردانگی سے زیادہ نسوانیت کا مظہر ہے۔ لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ محبوب سے محبت نہیں رکھتا۔ یا انیسویں صدی کا ایک آوارہ گرد بوالہوس ہے، سراسر زیادتی اور اس کے کردار سے صریح ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس کی محبت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کی وصیت پر ہر ممکن طریقہ سے عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب صبر وضبط کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے تو زہر کھالیتا ہے۔ جانبر ہونے کے بعد بھی اس کی سخت جانی اور بیچارگی ظاہر ہے:۔

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی دل دیا غم سے آشنائی کی،

ان تمام واقعات کی روشنی میں میر مثنوی کے محبت و خلوص پر شک کرنا بڑا ظلم ہوگا تمام مثنوی میں ایک موقع بھی ایسا نہیں ملتا جہاں اس کی اشکباری اور دلفگاری کا کافی ثبوت موجود نہ ہو۔ وہ حسیات کے لحاظ سے بالکل چھوئی موئی ہے لیکن عمل کے اعتبار سے نہایت کمزور قسم کا انسان ہے۔ اس کے کردار میں بطلانہ اور جوانمردانہ رنگ نہیں ہے۔ آخر میں زہر کھالینا اس کی عملیت سے زیادہ محبت کا ثبوت ہے لیکن مرزا نے ایک اچھے حقیقت نگار کی طرح یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اسے خواہ مخواہ معمولی انسانوں سے بلند تر کرکے دکھلائیں اور اس طرح

مثنوی کی اصلیت اور واقعیت کو مجروح کردیں - مرزا نے ہیروئن کو ہیرو سے بلند تر دکھلایا ہے اور یہ خوبی یا خرابی (؟) شیکسپیر کے بھی اکثر ڈراموں میں پائی جاتی ہے -

مرزا نے ہیروئن کے کردار پیش کرنے میں بڑی صناعی اور ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ میر افسانہ کے کیرکٹر کی طرح اس میں عمومیت نہیں پائی جاتی - وہ نہایت اعلیٰ تصوریت اور مثالیت کی حامل ہے - اس کے خیالات میں بلندی استواری اور مضبوطی پائی جاتی ہے اس میں محبت، حمیت، ایثار اور عمل کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اخلاقی قوت، مستقل مزاجی اور استواریٔ طبیعت کے لحاظ سے اسے ہیرو پر فوقیت اور برتری حاصل ہے وہ عام انسانوں سے بلند ہے لیکن اس دنیائے آب وگل سے بالکل علیحدہ اور غیر متعلق بھی نہیں ہے غرض اگر اس کے کیریکٹر کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو وہ کمالیات اور سیرت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ نظر آتی ہے - ہیروئن ایک شریف اور متوسط الحال طبقہ کی پڑھی لکھی لڑکی ہے اور صورت، شکل، چال ڈھال اور اخلاق میں اپنی مثال نہیں رکھتی - مرزا نے اس کی خوبصورتی اور جوانی کی تعریف اس طرح کی ہے :-

سبزۂ نخل گل جوانی تھا — حسن یوسف فقط کہانی تھا
رخ پہ گیسو کی لہر آفت تھی — جو ادا اس کی تھی قیامت تھی

ایک رنگین شام کو وہ محبوب نظریں ملتی ہیں اور آن کی آن میں دلوں کی دنیا تاراج ہوجاتی ہے ہیروئن کے اوپر بھی عشق کا آہستہ آہستہ اثر ہوتا ہے :-

چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے — دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
گوشِ فریادِ قلب سننے لگے — خود بخود ہاتھ پاؤں دھننے لگے
دردِ وغم دل کو آگیا جو پسند — سونا راتوں کا ہوگیا سوگند
موجِ الفت اسے ڈبونے لگی، — ایک اُلجھن سی دل کو ہونے لگی

اب وہ "چوں اشک از سرِ مژگاں چکیدم نم بنگر" کی مجسم تصویر تھی - ایک قطرۂ گریۂ بے اختیار تھی جس کو آغوشِ دامن سے محروم کردیا گیا تھا۔ اس کی طاقت کی کمی کے ساتھ ساتھ دل کا صبر وشکیب بھی رخصت ہونے لگا اور آخر کار اس نے بالکل مجبور ہوکر ایک خط لکھا جس کو ایک ماما کے ہاتھ میر مثنوی کے پاس بھیجدیا - لڑکی کی یہ جسارت بہت زیادہ بحث وتمحیص کا موضوع رہی ہے اور بہت سے لوگوں نے اسی بنا پر اسے "بے حیا" کا خطاب دیا ہے۔

سچ ہے فلسفہ جذبات سے ناآشنا منطقی اور مباحث علمیہ کے ماہرین ہذیانِ محبت کو اس سے زیادہ اور کیا سمجھ سکتے تھے! لیکن محبت، اخلاق کے اِن سخت اور جابر نظریوں کو تسلیم نہیں کرتی - دل کی تڑپ عقلیات کے اصولوں کی پابند نہیں ہے - عشق کی آگ ان معمولی حد بندیوں کو مسمار کردیتی ہے اور اس لئے ظاہر ہے

اس "صہبائے آتشیں" کو جانچنے کے لئے عقل و خرد کے ادبی پیمانے کام نہیں دے سکتے۔ اس کے علاوہ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ ہیروئن نے تحریر میں غیرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے غیرت و حمیت ٹپکتی ہے۔ لکھتی ہے :-

اس محبت پہ ہو خدا کی مار		جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
سارے الفت نے کھو دئے اوسان		ورنہ یوں لکھتی ہیں، خدا کی شان
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے		جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

عاشق اس خط کا جواب نہایت جسارت آمیز لہجہ میں لکھتا ہے :-

اب جو بھیجی یہ آپ نے تحریر		ہے یہ لازم کہ وہ کرو تدبیر
سختیاں ہجر کی بدل جائیں		دل کی سب حسرتیں نکل جائیں

اس خط کو دیکھ کر اس کے تخیل کو صدمہ پہونچتا ہے اور وہ ایسا جواب نامہ لکھتی ہے جو صحیح معنوں میں اس کی غیرت و حمیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے :-

تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی		کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی

آگے چل کر لکھتی ہے :-

تجھ پہ مرتے بھی گر مرے بدخواہ		یوں نہ لکھتی کبھی معاذاللہ
جان پاپوش سے نکل جاتی،		پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی

اسے اپنے خاندان کی عزت و شرافت کا پورا احساس ہے اس کا ثبوت مثنوی میں جا بجا ملتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اُسی کے تحفظ کے لئے محبت سے مجبور ہو کر جان قربان کر دیتی ہے اپنے دوست کو وصیت کرتے وقت بھی وہ اس پر بڑا زور دیتی ہے :-

ضبط کرنا، اگر ملال رہے،		میری رسوائی کا خیال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا		یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم		ساتھ تابوت کے نہ رونا تم

پھر ہدایت کرتی ہے :-

تذکرہ کچھ نہ کیجئے گا مرا		نام منھ سے نہ لیجئے گا مرا
آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے		سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے		تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

غرض تمام مثنوی میں بلا مبالغہ چودہ پندرہ جگہ اسی قسم کا تذکرہ ہے جس سے اپنی اور خاندان کی عزت و حرمت کا پاس اور لحاظ پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ احتراز و اجتناب کے بعد "وصل کا اقرار" ہوتا ہے اور اس "اعتراف شکست" کے بعد بالکل واقعات کا رخ بدل جاتا ہے۔ دونوں کے لئے دنیا محض "محبت" کا نام ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک حسین خواب ہے جو مجسم ہو جاتا ہے۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں، عہد و پیمان ہوتے ہیں، عمر بھر نباہ کے اقرار کئے جاتے ہیں —۔ لیکن یہ مسرت دیرپا نہیں ہوتی۔ والدین پر یہ راز افشا ہو جاتا ہے اور وہ ہیروئن کو بنارس بھیجنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ ہیروئن کے لئے یہ گویا ایک سزا ہے جو فلک نے مروجہ ضابطہ اخلاق کے خلاف بغاوت کرنے کے سلسلہ میں تجویز کی ہے لیکن ہیروئن اسے قبول نہیں کرتی وہ اسے حقارت سے ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ ایک بلند ہستی ہے جو اپنی دنیا آپ بناتی ہے اور اپنے بے پناہ عزم اور منشا سے واقعات کا رخ بدل دیتی ہے اس کی تخلیق محض نزاکت اور جمال ہی کی مظہر نہیں ہے بلکہ اس میں عزم اور ارادہ کی بھی ایسی بلندی ودیعت ہوئی ہے جو اسے کسی جبر کو اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی وہ اپنے آہنی عزم کے ساتھ عاشق سے آخری بار ملنے جاتی ہے اور اسے تمام واقعہ سے آگاہ کر دیتی ہے۔ یہ منظر نہایت دلدوز ہے اور اثر انگیزی کے اعتبار سے شاید ہی اس کی کوئی مثال اردو لٹریچر میں مل سکے۔ یہ اس کی آخری ملاقات ہے اور زندگی کی آخری شب۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی روح کی امانت کو موت کے سپرد کر دیتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت موت کی ہیبتناک صورت اسے ڈراؤنی نہیں معلوم ہوتی۔ سکرات کی تلخی اور نزع کی پرظلمت تکلیف کا احساس اسے پریشان نہیں کرتا۔ اس کی ہر ہر ادا سے ملکوتی سکون اور ارادہ مضبوطی ظاہر ہوتی ہے اور ان سب پر جو چیز غالب ہے وہ بے غرضی، جذبہ محبت اور حمیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نے اس کے اوپر سے خودکشی کی برائی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے — موت بہتر ہے ایسے جینے سے
خون دل کب تلک پیئے کوئی — بے حیا بن کے کیا جیئے کوئی
نوج انسان بے حمیت ہو — آدمی کیا نہ جس کو غیرت ہو
کہتی ہے بار بار ہمت عشق — ہے یہی مقتضائے غیرت عشق
چار پائی پہ کون پڑ کے مرے — کون یوں ایڑیاں رگڑ کے مرے
عشق کا نام کیوں ڈبو جائیں — آج ہی جان کیوں نہ کھو جائیں

ہیروئن کا تمام کردار اس سے بہتر اور مختصر الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا:-

گو کہ عقبیٰ میں رو سیاہ چلی — مگر اپنی سی میں نباہ چلی

اس کی لغزش کو لوگ لغزش کہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایسی جسارت، دلکشی اور خوبصورتی موجود ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس آخری منظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آسمانی دوشیزہ ہے جو کمالِ رعنائی و دلفریبی اسی مادیت آبادِ ارضی پر اُتری، ٹھہری اور جلدی لوٹ گئی رخصت ہوتے وقت اس کے یہ الفاظ معمولی لبوں سے ادا نہیں ہو سکتے تھے ؎

اب فقط یہ ہے خوں بہا میرا — بخش دیجیو کہا سنا میرا
سر سے لے کر بلائیں تا بہ قدم — بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کم بخت — بام پر آئی تھی میں کون سے وقت
پھر یہ بولی وہ پونچھکر آنسو — میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تو
آزماتی تھی تجھ کو کستی تھی — میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی

ہیروئن کی ساری زندگی صرف ایک لفظ ــــ محبت ــــ سے عبارت ہے۔ وہ اسی کے لئے زندہ ہے اور اسی کیلئے مرتی ہے۔ عاشق کا ذرا سا اضمحلال اسے بے چین کر دیتا ہے ؎

دل کو اپنے کرو ملول نہیں، — رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں،
ہم کو گاڑے جو اپنے دل کو کڑھائے — ہم کو ہے ہے کرے جو اشک بہائے

پھر مضطرب ہو کر کہتی ہے ؎

رو نہ اس طرح سے تو زار و قطار — دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
آپ اچھے بھلے، بچھڑ جائیں، — اور لینے کے دینے پڑ جائیں
میں دل و جاں سے ہوں فدا تیری — لے کے مر جاؤں میں بلا تیری،
میں ابھی تو نہیں گئی ہوں مر — کیوں سجائی ہیں آنکھیں رو رو کر
اشک بہتے ہیں ناگوار ترے — تو نہ رو ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں — یوں کہیں مرد وے بھی روتے ہیں

پھر عاشق کے ارادۂ خودکشی پر کہتی ہے :-

کون سا پڑ گیا ہے رنج و محن — جان کیوں دیں گے آپ کے دشمن
تم نے جی دینے کی جو کی تدبیر — حشر کے روز ہوں گی دامنگیر
تو سلامت جہاں میں رہ مری جاں — نکلیں ماں باپ کے ترے ارماں
واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا، — چاند سی بہو گھر میں بیاہ کے لا

پھر موت سے کھیلتے ہوئے، ذرا ان الفاظ کے ادا کرنے کے لئے جس صبر و ضبط کی ضرورت ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرمایئے

مرگ کا کس کو انتظار نہیں زندگی کا کچھ اعتبار نہیں،
خوب سا آج دیکھ بھال لو تم دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
حشر تک ہوگی، پھر یہ بات کہاں ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

یہ جذباتیت اور اس کی نشتریت بھی ملاحظہ فرمایئے :-

کل گلے سے کسے لگاؤ گے یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے
حال کس کا سُنائے گی آکر کس کی ماما بلائے گی آکر
ہم تو اُٹھتے ہیں اس مکان سے کل اب تو جاتے ہیں اس جہان سے کل
یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں پان کل کے لئے لگاتے جائیں

رات تیزی سے گزر رہی ہے۔ اُسے اس کا ایک دم سے خیال آتا ہے اور بے چین ہو جاتی ہے لیکن اس سطحی تلاطم کے پیچھے بھی جوشِ محبت، حسیت اور استواریِ عزم کا بے پناہ سمندر لہریں مارتا ہوا نظر آتا ہے :-

بولی گھبرا کے پھر ٹھہر مری جان کچھ سنا بھی کہ کیا بجا اس آن
حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے، اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
گود میں اپنی پھر بٹھالو، تم پھر گلے سے ہمیں لگالو، تم
ڈال دو پھر گلے میں باہوں کو پھر گلوری چبا کے منہ میں دو،
پھر کہاں ہم، کہاں یہ صحبت یار کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار
پھر مرے سر پہ رکھ دو سر اپنا گال پھر رکھ دو، گال پر اپنا
پھر اسی طرح منہ کو منہ سے ملو پھر وہی باتیں پیار کی کر لو
لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی
پھر ہم اُٹھنے لگیں بٹھا لو تم پھر بگڑ جائیں ہم منا لو تم
پھر بلائیں تمھاری یار لیں ہم، آؤ پھر سر سے سر اُتار لیں ہم

موت اور اس کی قربت نے اس نفسی واردات اور حیاتی بیان میں سوز و گداز اور حسرت و ارمان کی جو نیابان کیفیت پیدا کر دی ہے وہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے الفاظ میں نہیں سما سکتی۔

رات گزرتی جاتی ہے، ہر گھنٹے کی آواز موت کا تازہ پیام ہے۔ ہیروئن گھبرا جاتی ہے، اس نفسیاتی حالت کو مرزا نے خوب دکھلایا ہے :-

مردنی رخ پہ چھاگئی اس کے | دل میں وحشت سما گئی اس کے
دل پہ گزرا جو اس کے صبح کا شک | ہوئی استادہ جا کے زیرِ فلک
ٹھنڈی جس دم چلی نسیمِ سحر | ہوگیا حال اور بھی ابتر
اتنے میں صبح کی بجی دردی | ہوگئی دونی چہرے کی زردی
ہوئے ثابت جو صبح کے آثار | ہوگئی اور اس کی حالت زار
بید کی طرح جسم تھرّایا | سر سے لے پاؤں تک عرق آیا
باتیں کرنی جو تھیں سو بھول گئی | دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی

لیکن وہ ---- معمولی عورت نہیں ہے۔ اس کا خمیرِ حیات محبت و جرأت سے گوندھا گیا ہے وہ سراسر "ہمت عشق" ہے جس نے جسم اختیار کر لیا ہے وہ فوراً اپنی کمزوری پر قابو پا لیتی ہے اور کہتی ہے :

"بخش دیجیو کہا سنا میرا" پھر "میرے سر کی قسم نہ کڑھیو تو"

اور بالکل چلتے وقت :-

"آزماتی تھی تجھ کو کستی تھی، | میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی"

سبحان اللہ! اس دنیا کی ایک لڑکی، دنیا کی ہوتے ہوئے بھی، اس دنیا سے اور کیا دور ہو سکتی تھی؟ مثالیت کا اس سے زیادہ اور کیا عروج اُسے حاصل ہو سکتا تھا۔ مادیت اور روحانیت (Spiritualism [illegible]) کا اس سے خوبصورت اجماع (Conflux) اور کیا ممکن تھا۔ یہ نامراد زیست، جوان ارمانوں کی مالک و مظہر لڑکی، ایک "ستارہ" ہے، اس عالم سے دور اور نزدیک، جس کی ضیاپاشیاں ہماری روح میں طوفانِ نکہت و نور برپا کر دیتی ہیں، نہیں - بلکہ یہ لطف ہمارا مایۂ خمیر بن جاتا ہے اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر روح اور جسم کا رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جائے گا۔

مثنوی زہرِ عشق میں زبان، منظر کشی، جذبات نگاری اور نفسیاتی واقعیت کا اعجاز نظر آتا ہے۔ بعض اخلاقی مضامین مثلاً دنیا کی ناپائداری اور بے ثباتی کے بھی نہایت اعلیٰ مرقعے ملتے ہیں۔ روزمرہ اتنی صفائی کے ساتھ دوسری جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ اسی طرح عورتوں کی زبان بالکل انھیں کے انداز میں لکھی گئی ہے اور مرزا نے اس کا بھی پورا حق ادا کر دیا ہے۔ زبان اور بیان کے اعتبار سے ساری مثنوی پڑھنے اور لطف لینے کے لایق ہے یہاں چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

سبز نخلِ گل جوانی تھا | حسنِ یوسف فقط کہانی تھا
بام سے کچھ اُترتی جاتی تھیں | چہلیں آپس میں کرتی جاتی تھیں

گیسو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں،   چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں
میرے بچے کی جو کڑھائے جان   سات بار اس کو میں کروں قربان
اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں،   آپ آفت میں جان کو ڈالیں
اب جو نام خدا جوان ہوئے   ایسے مختار میری جان ہوئے
چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے   دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے
گوش، فریادِ قلب سننے لگے،   خود بخود ہاتھ پاؤں دھننے لگے
موج اُلفت اُسے ڈبونے لگی   ایک اُلجھن سی دل کو ہونے لگی
اس محبت پہ ہو خدا کی مار   جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار،
سارے اُلفت نے کھو دئے اوسان   ورنہ یہ لکھتی میں، خدا کی شان
تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی،   کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
کالا دانا ذرا اُتروا لو،   رائی لون اس سمجھ پر کر ڈالو
جان پاپوش سے نکل جاتی،   پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی،
مالزادی نہیں یہاں کوئی   جو کرے تم سے گرمیاں کوئی
دیکھ تحریر فیل لائے آپ   خوب جلدی، مزے میں آئے آپ
جائے عبرت سرائے فانی ہے   موردِ مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے   آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم   آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے، نوجواں تھے جو   صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی،   نام کو بھی نہیں نشاں باقی
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے   یہی دنیا کا کارخانہ ہے،
موت سے کس کو رستگاری ہے   آج وہ، کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں   موت عینِ حیات ہے اس میں
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے   تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
عمر بھر کون کس کو روتا ہے   کون صاحب، کسی کا ہوتا ہے
حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں   ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

حسرت دل نگوڑی باقی ہے — اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے
آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں، — اور لینے کے دینے پڑ جائیں
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں — یوں کہیں مردوے بھی روتے ہیں
کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور — کہتی ہوں کچھ نکلتا ہے کچھ اور
نوج، انسان بے حمیت ہو — آدمی کیا، نہ جس کو غیرت ہو،
آزماتی تھی تجھکو گستی تھی — میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے — جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
ہوئیں کس بات پر خفا بولو — اماں واری، ذرا جواب تو دو
ترک عادت بھی اک عداوت ہے — رات کا جاگنا قیامت ہے

"قصہ بے نظیر و بدرِ منیر" کے بعد، جس کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو چکے تھے، مثنوی زہرِ عشق اُردو شاعری میں، زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور اپنے حیاتی رنگ کے اعتبار سے بڑی مکمل چیز ہے، اور اسکے حسین اثرات اور اثرات کی جراحتہ سامانیوں کا اگر کسی طرح بیک جنبشِ لب اعتراف کیا جا سکتا ہے تو صرف ڈیوس کے حسبِ ذیل الفاظ میں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی شاعری کا کوئی جامہ تعریف ایسا نہیں ہے جو مرزا کی مثنوی پر اتنا چست بیٹھتا ہو:-

"ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سانسوں کی آمد و شد پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس تعداد پر کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سانس رکا رہے یا خارج ہو - اب خواہ یہ دونوں صورتیں کسی جذبۂ محبت کے ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذبِ نظر چیز کو دیکھ کر عمل میں آویں۔"

خواجہ احمد فاروقی، بی - اے

اگر اکتوبر کا پرچہ آپ کو نہیں پہونچا

تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ بھیجئے، نومبر ختم ہونے کے بعد آٹھ آنے کے ٹکٹ وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

اس سے پہلے شادی کا خیال یا تو لوگوں کو خالیت
دلکشی۔
نگہداشت کا۔ سو اب نہ یہ ہے نہ وہ۔
ہیں اور کوئی صورت نہیں کہ ایک جگہ قدم جما کر

ہیں۔ اس خیال سے ہٹ کر شادی کرنا آپ لوگوں
ہیں آئی کہ بیوی سے محبت کیسی ؟
جہاں "دوستی" کہلاتی ہے اور محبت سے زیادہ بلند

ہی لیجئے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ اپنی موجودہ
شادی کا خیال ترک کر دیجئے اور اگر آپ کی ہونے والی
کے آپ کی جوانی کو آزاد چھوڑ سکتی ہیں، تو شادی

اس ولولہ کی عمر کتنی ہے۔ آپ کیوں اس غریب کی

دیکھا۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست نے چند
میں نہایت انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔ لیکن
کی گردن کاٹ ڈالتے ہیں، جب چودہ احباب ذبح
ت مکمل ہو گئی۔ میں ان تمام ذبیحوں کو دیکھ کر کچھ کہنا

چاہیئے تو سہی یہ کیا بات ہے۔ ہاں اس کے ساتھ ہی
دوست کا ذکر کیا ہے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں
وت نے ان کو تباہ کر رکھا ہے۔ بعض اوقات
نے آپ سے پوچھا کہ اس خواب میں کس بات

قت نگاری کے
ت جو ادب پیدا
ن خیالات کا
ا ہوں۔ (صاحب
سے پہلے ۶ء میں
ہی نو نیا ادب
ل سے مجھے
سمجھتا ہوں
خاش کی

جا کر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے

رسوائی
ہی سہی
ات کو وہیں "برمحل" دیکھ کر لطف اُٹھاؤں،
رے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ
اور ہے

پڑھتے ہوئے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اُردو کی
نہ آیا چاہ میں گزری۔
ی نے ان بحروں میں بعض اُردو مثنویوں کی طرف

شہید کی مثنوی قصۂ بلالی موجود ہے۔
نوی ایجاد رنگیں، محمد عبد اللہ خاں کی،
بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید

تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو

کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اُسے

ادب اور اسک

میرے ہموطن اور نوجوان ادیب جناب فضل الدین صاحب
پر ایک مضمون سپرد قلم فرمانا تھا (جو نگار بابت اگست ۳۹ء میں
اس مضمون کی بنا میرے اُس مضمون کی تنقید پر رکھی جو نیا ادب
کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ ان کی بصیرت افروز تنقید سے مجھے
تنقیدی مجادلے یعنے "جواب بعد الجواب" سے میں سمجھتا ہو
ہو کر اصل نقطہ بحث کی گرماگرمی میں غائب ہو جاتا اور ذاتی پرخاش کا
سمجھتا ہوں کہ نقاد اپنے اعتراضات پیش کر دے اور پھر پڑھ
پر عمل کرتا اگر فاضل نقاد نے میرے مفہوم کو صحیح طور پر پیش کیا ہوتا یا ج
چنانچہ میں ناظرین نگار اور خود فاضل نقاد کی خدمت میں ملتمس ہو
لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد پڑھنے والوں کو حق ہوگا کہ وہ مجھے اد
میں فرمائی ہیں یا اسکے خلاف۔ لیکن اگر اسکے بعد آخر صاحب نے د
کا اعلان کئے دیتا ہوں۔

میں یہ کہنے کی جرأت نہ کروں گا کہ فاضل نقاد نے میرے مض
میں ہی اپنے مضمون کو ان کے لئے قابل فہم نہ بنا سکا۔ میں ان کو یہ ا
لفظوں میں پیش کر کے اس کا مطلب ہی بدل دیا ہے اور فاضل نقا
آجانے کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ مگر یہ کہنے پر مجبور ہوں
وہ اُسی ذیل کے ہیں جیسے کوئی قرآن سے "نماز کے قریب نہ
ادبی مسلک کے اعتبار سے میں واقعیت نگاری کا
اُسی عقیدے کی اشاعت کے لئے میں نے ناظرین نیا ادب

جا کر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے

رسوائی
ہی سہی
ت کو وہیں "برمحل" دیکھ کر لطف اُٹھاؤں،
رے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ
اور رہے

ئے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اردو کی
میں گزری۔
ی نے ان بحروں میں بعض اردو مثنویوں کی طرف
شہید کی مثنوی قصہ بلال موجود ہے۔
نوی ایجاد رنگیں، محمد عبد اللہ خاں کی،
بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید
تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو
س کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اُسے

حسرت دل نگوڑی باقی ہے

آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں اتے پر چل رہا ہے۔ "حقیقت نگاری" آرٹ برائے زندگی کی قائل ہے۔

ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں رہا ہے اسے تعمیری ادب کہا جاتا ہے۔"

کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور اظہار فرمایا ہے، اس کی بنا پر میں انھیں "مطمحی" مسلک ادب کا

نوج، انسان بے حمیت ہو س لئے ان کو میرے ادبی عقیدے سے اختلاف ہونا ہی چاہئے۔

آزماتی تھی تجھکو کستی تھی واقعیت نگاری کے مسلک کی تنقید کرکے بتاتے کہ آرٹ برائے لذتیت

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے نہیں کہ ادب کے باب میں میرا ان کا اصولی اختلاف ہے۔ یا پھر

ہوئیں کس بات پر خفا بولو فرار دینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ میرا قومی ادب کے لئے اُسکے

ترکِ عادت بھی اک عداوت ہے لی استدلال تھا جو واقعیت نگاری کے عقیدے کے تحت تھا۔

"قصہ بے نظیر و بدرِ منیر" کے بعد، جس کو لکھے دپھر میرا ذیلی استدلال اپنی جگہ اٹل رہے گا۔

میں، زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور لطیف صاحب اگر ادب کے مفہوم پر غور کر لیتے تو ان کے اصول

حسین اثرات اور تاثرات کی جراحت سامانیوں کا اگر بری معذوری پر نظر نہیں کی۔ اور میری معذوری خود فاضل نقاد

کے حسب ذیل الفاظ میں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی

پر اتنا چست بیٹھتا ہو:-

۔لیکن عام رائے یہ ہے کہ اس کا صحیح جواب اب تک کسی نے نہیں دیا "ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سائنس

انگریزی مقالے میں ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے" کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سائنس رکار ہے یا فارغ

ود نہیں، مجھے تو اپنے مضمون پر تنقید کے بعض نقاط کو واضح کرنا ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظریہ

اضل نقاد صاحب کے مضمون کے برابر مضمون طیار ہو جاتا۔

کے متعلق دنیا کا فیصلہ تھا کہ وہ فیصل شدہ نہیں ہے۔ دنیا کے

ب آپ کو اختیار تھا، آپ نے اپنے انگریزی مقالے میں ادب

ت جو اپنی ہی زبان سے سر کھپاتا رہتا ہو اگر اس مقالے کی

اگر اکتوبر کا پرچہ آر دگیا نائنٹینتھ سنچری میں تو اس کی اصلاح کی کیا صورت ممکن ہے

تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ۔ مفہوم دنیا میں متعین نہ تھا اور اس گرانقدر مقالے تک میری

وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔ احسان ہے کہ وہ تعریف ادب انگریزی سے اُردو میں بھی

ے کہ "آرٹ اپنے زمانے کی زندگی کا آئینہ بھی ہوتا ہے اور

اُس زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ بھی ------ اور ادب د ،جا کر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے

فاضل نقاد کا خیال ہے کہ کلچر بدلنے والی چیز نہیں کیونکہ

میں بادب گزارش کروں گا کہ جو میں نے عرض کیا وہی صحیح ہے اور رسوائی

ایک تعلیم یافتہ کے مقابلے میں، ایک تعلیم یافتہ ایک ادبی آدمی کے ہی سہی

مقابلے میں، ہمیشہ کم درجہ تقیف ہوتا ہے، اور یہ روزمرہ کے مشاہدات کو وہیں "برمحل" دیکھ کر لطف اُٹھاؤں،

مقالے لکھتے ہیں، اُردو رسایل میں ان کا شاعرانہ کلام بھی چھپتا رے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ

اتفاق سے اُن کے کوئی بھائی یا عزیز جو انھیں کے ماحول اور اور رہے

اوصاف سے متصف نہ ہوں جو فاضل نقاد کی خصوصیات ہیں

مطلب یہی ہے کہ انسانی ثقافت میں ادب کا ذوق و مطالعہ بڑا کا

ادب کے ذریعے سے عوام میں مدنیت اور تہذیب عا

فلاطون کا یہ قول ہے کہ "حسین روح حسین جسم تلاش کرتی ہے"

کیسی روح کو حسین کہیں گے، تو ان کو پھر فلاطون کی تصانیف

بتا سکیں گے کہ ایک مکروہ شکل کا کیڑا جب تتلی کا حسین جسم اختیار بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اُردو کی

یا اُس جسم میں آکر حسین ہوگئی، یا تتلی حسین ہی نہیں؟ فاضل میں گزری۔

کے اندر ہے یا اشکال میں؟ فاضل نقاد نے حسن کا مدار اگر ا بھی نے ان بحروں میں بعض اُردو مثنویوں کی طرف

پر مجبور ہوں گے اور اگر اشکال میں حسن کو تسلیم کیا تو بدتوارہ ا

بھی ختم نہ ہوگی۔ انھیں "حسن" کے "خیر مجرد" شہید کی مثنوی قصۂ بلال موجود ہے۔

لکھنا پڑے گی اور اس صورت میں ان کی جنگ بڑے بڑوں ثنوی ایجاد رنگیں، محمد عبداللہ خاں کی،

فلاطون کے نظریے میں پناہ لیتے ہوئے فاضل نقاد کا بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید

بیان نہیں ہے۔ "حسین جسم کی تلاش" کے کیا معنی ہیں؟

کیا ہر حسین جسم کی روح حسین ہوتی ہے؟ اور حسن روح کا تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو

فاضل نقاد نے یہ کہکر سلاست زبان کا طرفدار ور

اس خیال کا خلاق سمجھتا ہوں۔ فاضل نقاد کو میں یقین دلاؤں گا بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اسے

میں کہیں یہ دعوے کیا ہے۔ وہ میرے مضمون کو پھر پڑھیں

مجھے ورڈزورتھ کا خیال بتا دیا۔

حسرت دل نگوڑی باقی ہے زور تھے کے نظریۂ سلاست زبان کے چیتھڑے اُڑا دئے۔ بہت خوب!
آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں اس کی قوم اور ملک میں اور خود فاضل نقاد کی قوم اور ملک میں،
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں۔ وہ دفن کر دیا گیا؟ اور کیا فاضل نقاد کو صدمہ نہ ہوگا اگر میں انھیں
کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور ر میں سلیس زبان کے حامی پیدا ہوتے رہے ہیں، اور آج بھی
نوح، انسان سب بے حمیت ہو گئے جن کی اصابت رائے سے شاید فاضل نقاد کو بھی مجال انحراف
آزماتی تھی تجھکو کستی تھی

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے ل ظاہر کیا تھا کہ چونکہ ادب قومی زندگی کا آئینہ اور اس کے سدھار
ہوئیں کس بات پر خفا بولو ہیں موضوعات کو بھی جگہ ملنا چاہئے جواب تک ادب سے خارج تھے
ترکِ عادت بھی اک عداوت ہے ۔ ملازمی ہے اور اس لئے ہماری ادبی زبان سلیس ہو تاکہ اس ادب
"قصہ بے نظیر و بدرِ منیر" کے بعد، جس کو لکھے س سلسلۂ گفتگو میں میں نے "عقیق تراشیدہ" اور "لعل گویا" کی تشبیہات
میں زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور ۔ مثالاً پیش بھی کیا تھا کہ کیا یہ اظہار و بیان حسین نہ کہا جائیگا۔
حسین اثرات اور اثرات کی جراحت سامانیوں کا اگر بان کے مخالف۔ اس لئے ان کو لازم تھا کہ وہ میرے مثالی جملے کو
کے حسب ذیل الفاظ میں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی ق تراشیدہ" اور "لعل گویا" ہی حسین اظہار بیان ہے۔ اسکے
پر اتنا چست بیٹھتا ہو:۔ ن اشعار پیش کر دئے (حالانکہ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تمام

"ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سائنس فاضل نقاد فلاطون کی وہ سند لائے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔
کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سائنس رکار ہے یا خارج ہے کہ فلاطون کا طالب العلم ہونے کی حیثیت سے فاضل نقاد کو فلاطون
ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظر چیز پھیرنا ممکن ہے جو ان کو یہ نہ معلوم ہو کہ فلاطون کے ادبی خیالات
ت پر مبنی بحثوں نے مسترد کر دیا اور جب اتنا کچھ معلوم ہو تو انکے
تبہ موضوع کے رتبے کے موافق ہونا چاہئے۔ اس کو سمجھ لینے کے
ہے، تمام تر صحیح نہیں رہتا؟ اس کا بڑا مدار مصنف کی اس
موضوع کے مطابق ہوں گے اور موضوع سے موافق زبان استعمال

اگر اکتوبر کا پرچہ

تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ
وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔

موضوعات ادب سے گفتگو کی گئی ہے، یہ ہے:۔
عام زندگی سے ادب کے موضوع جتنا اتنا ہی حسین ہو سکتا ہے
قرار دینا۔ کیونکہ زندگی بہر حال حسین ہے اور حسن صداقت سے خالی

نہیں - حسن و صداقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں - کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ہ جا کر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے
محنت مشقت مقدس نہیں ؟ وہ رشتہ و ہم آہنگی جو ایک کسان کو اپنی آراض
بھٹی کے سامنے ایک مزدور کا پسینا بہانا شان سے خالی ہے ؟" رسوائی
اس عبارت کا فاضل نقاد نے جو خلاصہ کیا ہے وہ یہ ہے ہی سہی
" زندگی ہر جگہ حسین ہے تو پھر کسان مزدور ہی ہمارے موضوع کیوں ت کو وہیں " برمحل " دیکھ کر لطف اُٹھاؤں ،
اب میں حیران ہوں کہ فاضل نقاد کو الفاظ کے مفہوم و معنی رے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ
نہ جانوں تو کس دل سے ؟ فاضل نقاد کم سے کم دو زبانوں کے ادیب اور ہے
کا صحیح استعمال اور اُس کا صحیح مفہوم معلوم ہونا چاہئیے اور ایک نق
لیکن میرے اقتباس اور فاضل نقاد کا خلاصہ اوپر نقل کر دئے گئے
زندگی حسین ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں فاضل نقاد نے
مناظر سے آنکھیں بھی بند کر چکے ہیں اور اسپتال اور پوسٹ مارٹم کے
بھی کیا ہے اور یہ بات ان کے خیال میں کافی دلیل ہے کہ زندگی غ
نقاد کی خدمت میں بس یہی عرض کر سکتا ہوں کہ وہ آرٹ کے فلسفہ ئے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اردو کی
حُسن ہے ! پہاڑوں کے بھیانک اور پوسٹ مارٹم کے مکروہ نظاروں یں گزری -
اپنے محبوب مشغلہ " جمالیات " کے بھی نصف دوست ہیں ، اور ی نے ان بحروں میں بعض اردو مثنویوں کی طرف
ہوتے ہیں - اس لئے میں یہ دوہرانے پر مجبور ہوں کہ " زندگی
نے مجھے یہی سمجھایا ہے - شہید کی مثنوی قصۂ بلال موجود ہے -
سمرسیٹ موگھم اُسی برادری کا ایک فرد ہے جس کے بہم نوی ایجاد رنگیں ، محمد عبداللہ خاں کی ،
ہیں - فاضل نقاد اس کے ادبی رتبے اور مقبولیت سے انکار بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید
شایع ہوئی ہے - فاضل نقاد اگر اس کی رائے کو کوئی وقعت د
کہ موگھم نے ڈاکٹری پڑھی اور ڈاکٹری سے ہی زندگی شروع کی - تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو
ملہم بنے - موگھم کہتا ہے کہ اسپتال خاکاروں کے لئے بہترین درس
فاضل نقاد کی طرح آئیڈیل ادب کا بھی قایل نہیں ہے - غرض ن کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے - اُسے
فرمائے ہیں ان سب کا جواب موگھم نے اس کتاب میں دیدیا ہے
یقیناً جانتے ہوں گے ان کا خیال ہے پوسٹ مارٹم کا مکروہ تر

حسرت دل نگوڑی باقی ہے پنچے گا، مگر خیال ہے کہ وہ اسے ایک آپریشن کی طرح برداشت کرلیں گے

آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں نے لیتا ہوں کہ ان تمام انگریز ادبا و شعرا کے باب میں جن کے

ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں نقاد کی رائے صحیح و درست ہے۔ لیکن کیا فاضل نقاد یہ ثابت

کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور در مکروہ پہلو کو (یعنے مزدور و کسان کی زندگی کو) اپنے ادب

نوج، انسان بے حمیت ہو یا ان کا ادبی مرتبہ ٹھیکرے کے ادبی مرتبے سے کم ہے جو فاضل

آزماتی تھی تجھکو کستی تھی ہے؟ کیا فاضل نقاد بتلائیں گے کہ انگریزی ادب ڈکنس اور

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے مکروہ پہلو کے مفسر ہیں؟

ہوئیں کس بات پر خفا بولو یا ہے کہ اردو ادب ایک ہی ڈھرے پر چل رہا ہے۔ فاضل

ترک عادت بھی اک عداوت ہے جو کچھ لکھا ہے، یہ ہے:-

"قصہ بے نظیر و بدر منیر" کے بعد، جس کو لکھے تے ہیں تو انیسویں صدی کے آخر تک ہمارا ادب امراء کے تفریحی

میں، زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور کار آمد معلوم نہیں ہوتا کہ امیروں کی تفریحوں میں اضافہ کا سبب

حسین اثرات اور اثرات کی جراحت سامانیوں کا اگر کے اندر امیروں کے طبقے کی بھی خاص خاص حالتوں کا نقشہ تو نظر آتا

کے حسب ذیل الفاظ ہیں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی ایسے ادب کو جس کے اندر عام قومی عادات و خصائل نظر آتے

پر اتنا چسپت بیٹھتا ہو:- ویں صدی شروع ہونے کے بعد سے ہمارا ادب رنگ بدلتا ضرور

"ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سافسو ہے لیکن یہ حقیقت نگاری بھی اس مقصد کو پورا نہیں کرتی کہ ادب

کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سانس رکا رہے یا خارج ہے فیصدی غریبوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرسکتی ہیں۔

ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظر چیز کے اندر لفظی انقلاب تو ہے لیکن حسنی انقلاب کی جھلک بہت

انقلابی ہوا"

ہے، فاضل نقاد نے طویل بحث کر ماری ہے، حالانکہ اس

ہیں بھی ناظرین نگار فیصلے کے مجاز ہیں کہ وہ فاضل نقاد کا

اگر اکتوبر کا پرچہ آ

ادب کا بدلتی ہوئی حالت کے متعلق جو استدلال فرمایا ہے ایک

م ہو۔

تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ بت پر تنقید کرنا تھی، اس لئے انھوں نے میرے مضمون کی

وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔ یں کا دانا،" اور نہ "کسی ہنر میں یکتا"، فاضل نقاد کو ایسی

؟

دیکھئے اور سمجھئے، میری غایت انشاء یہ تھی اور اب کہ آپ
آئے گا کہ انسانیت کے پسپا طبقے دنیا کے ہر حصے میں چونک پڑ۔
قوت سے زبردست کام لیا گیا ہے اور ہمارے ادیبوں اور شا
دینا چاہئے جس کے اندر قوم کی اجتماعی زندگی چھلکے اور جو ق
اس غایت تحریر سے فاضل نقاد نے اپنی تنقید میں مطا
لیکن ان خیالات کو غلط ثابت فرمایا ہے — آخر مضمون میں فاض
حسین انشاء کا نمونہ پیش کیا ہے، جس کے الفاظ بہت خوشنما ہیں
کا انکشاف ہے! فاضل نقاد فرماتے ہیں:-

"آج دنیا میں اگر کوئی مذہب کامیاب ہے تو وہ مذہب ہے
باگ ڈور پیران خورد سال کے ہات میں ہے"

دنیا کے مفکر آج تک اس ادھیڑبن میں لگے ہوئے تھے
چیز کو قرار دیں۔ الحمدللہ کہ میری غلط نگاری صرف ادب کی ایک قد
حتمی بنوا دیا — فاضل نقاد نے استعارہ فرمایا ہے، اور ا
سے ان کا مقصود یورپ کا مذہب یعنی مسیحیت ہے اور کامیا
مگر میں تو مانے لیتا ہوں کہ مذہب کا مقصود و منتہا اس سے بہ
کامیابی بھی لوہے لکڑی کے بڑے بڑے کارخانوں سے بہتر ا
بہرحال مجھے فاضل نقاد کی تنقید سے جو ہدایت ملی ا
دعا کرتا ہوں جو ایک ہادی کو ملتی ہے یعنی "اللہ آپ پر رحم ک
دیکھئے آپ ادیب و شاعر ہیں، اس فقرے کے بھی غا
تھا:- "رحم اللہ بدانی اے عیوبی" — اور
آخر کلام پر مشوشاً نہیں بلکہ تفریحاً عرض کرتا ہوں کہ ا
واقف ہیں لکھ گیا ہے کہ:-
"...ould only think

جا کر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے
رسوائی
ہی سہی
ت کو وہیں "برمحل" دیکھ کر لطف اٹھا دوں،
ارے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ
اور سے

ائے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اردو کی
یں گزری۔
ی نے ان بحروں میں بعض اردو مثنویوں کی طرف

شہید کی مثنوی قصۂ بلالی موجود ہے۔
نوی ایجاد رنگیں، محمد عبداللہ خاں کی،
بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید

تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو
س کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اسے

حسرت دل نگوڑی باقی ہے
آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں
کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور
نوج، انسان بے حمیت ہو
آزماتی تھی تجھ کو گستی تھی

ت نیاز

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے ڈاک سے ملا - ساری رات اس بے چینی میں کٹی کہ کب صبح ہو اور
ہوئیں کس بات پر خفا بولیں، لیکن اب یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کس کو لکھوں -
ترکِ عادت بھی اک عداوت ہے لیکن جب جذبات کا ہجوم طاقت گویائی چھین لے تو اسے کیا
"قصہ بے نظیر و بدرِ منیر" کے بعد، جس کو لکھتی ہے --- شاید سکوت !
میں، زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات اور مصر ہوں تو اس کو احسان فراموشی نہ سمجھا جائے - اور نہ میرے
حسین اثرات اور اثرات کی جراحت سامانیوں کا اگر
کے حسب ذیل الفاظ میں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی جو موجودہ حالات میں مجھ پر عاید ہوتی ہیں، امید ہے کہ آپ کو
پر اتنا چست بیٹھتا ہو :-
، جب ضرورت ہو تار دیکر بلا لیجئے

"ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سائنس
کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سائنس رکار رہے یا فارن
کہ دنیا کیا کہتی ہے، آپ کی دنیا مجھ سے بے خبر، میں آپ کی
ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظر چیز
کیا

، علم زجاہ بے نیاز
، ہم زرِ من محک نخواست
گا، لیکن اسی دنیا کے اُصول کو سامنے رکھ کر جس کے آپ دلدادہ
زیادہ لبریز شکایت ہے
، انھیں میں آپ مجھے پھر مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور اس کا نام آپ نے
خدا جانے کیا کیا - باز آیا میں آپ کی اس "خواجگی و سرپرستی" سے!
اس دنیا سے بھی بیگانہ بنا دینا چاہتے ہیں، جہاں یہ کوئی نہیں پوچھتا
گا، لیکن ابھی نہیں، کلیجہ ذرا اور پتھر کا بنا لوں -

اگر اکتوبر کا پرچہ آ
تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ
وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے -

صدیقی، حیران ہوں کہ آپ کو کیا مشورہ دوں۔ ہ جاکر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے
بنا دیتا تھا یا مسرور اور اب اس کی طرف سے نہ خوف باقی رہا ہے
خوف نتیجہ تھا ذمہ داریوں کے احساس کا اور دلکشی اخلاق رسوائی
ہم سب آزادی کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہے جارہے ہی سہی
یہ تو دیکھیں کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں جا رہے ہیں۔ ت کو وہیں "برمحل" دیکھ کر لطف اُٹھا ؤں،
عورت و مرد کے جنسی تعلقات کا شادی سے کوئی واسد ارے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ
کے نزدیک محبت کی توہین ہے اور یہ بات میری سمجھ میں آج تک اور ہے
وہ محبت جس کا تعلق صرف جنسی خواہش سے نہ ہو، میرے
چیز ہے، لیکن آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی۔
بہرحال آپ نے میری رائے دریافت کی ہے تو اسے
"حیاتِ معاشقہ" کی لذت کچھ عرصہ تک قایم رکھنا چاہتے ہیں
بیوی میں اتنا صبر و تحمل ہے کہ وہ صرف آپ کی دوستی پر قناعت
میں کوئی حرج نہیں۔ ے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اُردو کی
آپ کی طبیعت سے خوب واقف ہوں اور جانتا ہوں یں گزری۔
عمر تباہ کریں گے۔ ی نے ان بحروں میں بعض اُردو مثنویوں کی طرف

مکرمی۔ رات میں نے نہایت عجیب و غریب خوا شہید کی مثنوی قصۂ بلال موجود ہے۔
مخصوص احباب کو دعوت دی ہے اور ان کی ضیافت کے اہ ثنوی ایجاد رنگیں، محمد عبداللہ خاں کی،
جسوقت مہمان کرسی پر آکر بیٹھتا ہے تو پشت کی طرف سے جاکرا ۔ بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید
ہو جاتے ہیں تو میری طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اب د
چاہتا ہوں کہ دفعتًا آنکھ کھل جاتی ہے۔ تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو
آپ کو تعبیر بتانے میں بڑا ملکہ حاصل ہے، ذرا سوچ کر
میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے جن ۔ سا کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اُسے
نے ہمیشہ اپنے احباب کے لئے قربانیاں کی ہیں اور اسی
خواب میں اشارات خفیہ ضرور پائے جاتے ہیں اسی لئے

حسرت دل نگوڑی باقی ہے کا قایل ہوں یا نہ ہوں لیکن بعض ایسے حضرات سے ضرور واقف ہوں

آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں جو صبح کو ہونے والی ہے۔

ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں

کچھ عجب ہو رہا ہے جان کو طور ماند ایں ہمہ ناگفتہ ہے

نوج، انسان بے حمیت ہو نہ ٹھیک نہ کوئی ہے کسے

آزماتی تھی تجھکو کستی تھی ہے اور "کسے" کا اشارہ کس طرف ہے؟ غالب یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے میرا فیصلہ یہ ہے کہ اپنے سوا ساری دنیا "کسے" میں شامل ہے۔

ہوئیں کس بات پر خفا بولو کے آدمی نہیں اور تم سے باتیں کرنا گویا اپنے آپ سے سرگوشیاں

ترکِ عادت بھی اک عداوت ہے

"قصہ بے نظیر و بدرِ منیر" کے بعد، جس کو لکھے ایک شعر یاد آگیا:-

میں، زبان اور بیان، سیرت نگاری، نفسی واردات او نے کیا بزم دو عالم کو خراب

حسین اثرات اور اثرات کی جراحت سامانیوں کا اگر وراں سے کہے عشق اللہ

کے حسب ذیل الفاظ میں، اس لئے کہ آرٹ اور وہ بھی اس کے کہ سر منڈا کر، گلے میں کفنی ڈالکر، ہاتھ میں سونٹا لئے ہوئے

پر اتنا چست بیٹھتا ہو:-

"ہمیں زندگی پر کوئی رائے زنی محض سانس گر دیر زید شام بمیرد

کرنا چاہئے جتنی مرتبہ کہ سانس رکا رہے یا خارج ہے۔

ماتحت ہوں یا کسی خوبصورت اور جاذب نظر اب ان سب کو ملا کر میں نے ایک کر لیا ہے اور وہ یہ کہ دیو بند

ٹھکرا انھوں نے دیا۔ آیندہ جو کچھ پوچھنا ہو مہربانی فرما کر براہِ راست

کو چھیڑ کر تراویح شبینہ کی نیت باندھ لوں اور نہ اتنی عقل کہ جو

اگر اکتوبر کا پرچہ آ...!

تو بیرنگ طلب کیجئے یا پانچ پیسہ کے ٹکٹ

وصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے۔

تم اس بت کو رام نہ کر سکے۔

میں قدر زنار می بستم!

آخر بات کیا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں دونوں ہی ضعیف

ہیں۔ یہ سارے طنطنے معلوم ہوتا ہے جلوت ہی کے ہیں اور خلوت میں جاکر شاید وہی بات پیدا ہو جاتی ہے جسے تم تو کبھی نہ ظاہر کروگے لیکن غریب غالب کو آخر میں کہنا ہی پڑا کہ

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

سوچ رہا ہوں کہ ایک دن کے لئے آؤں اور تمہاری شکست کو وہیں "برمحل" دیکھ کر لطف اُٹھاؤں، لیکن جانتا ہوں کہ اُسوقت تم کیا کروگے، اور کیا کہوگے! کیا تمھارے متعلق سعید کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ

شیر قالیں اور ہے شیر نیستاں اور ہے

انتباہ و تصحیح

اکتوبر کے باب الاستفسار میں مثنوی کی بحروں کا ذکر کرتے ہوئے بعض بحروں کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ اُردو کی کوئی مشہور مثنوی ان میں موجود نہیں ہے یا کم از کم یہ گر میری نگاہ سے نہیں گزری۔

لیکن ہمارے فاضل دوست محمد عباس صاحب طالب صفوی نے ان بحروں میں بعض اُردو مثنویوں کی طرف مجھے توجہ دلائی ہے، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"بحر سریع میں مولوی حفظ اللہ بندہ کی مثنوی اور غلام امام شہید کی مثنوی قصۂ بلال موجود ہے۔ اسی طرح بحر رمل مسدس میں سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی ایجاد رنگیں، محمد عبد اللہ خاں کی، مثنوی عابد اور مومن دہلوی کی ایک مثنوی پائی جاتی ہے۔ بحر رمل مخبون مسدس میں بھی غلام امام شہید کی مثنوی نغمۂ عشق موجود ہے۔"

اگر طالب صاحب ایک ایک شعر بھی لکھ دیتے تو بہتر ہوتا، تاہم قارئین نگار اکتوبر کے رسالہ میں حاشیہ پر اس کو نوٹ فرمالیں۔

اسی مضمون میں کاتب صاحب نے غلطی سے رمل مسدس کی بحر میں ایک فاعلاتن زیادہ لکھ دیا ہے۔ اُسے بھی قلم زد کر دیا جائے۔

ریاض مرحوم کی انشاء عالیہ

سنہ ۳۲ء میں، جب میں حیدر آباد گیا تو مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے دولتکدہ پر شعر و سخن کی مختلف صحبتوں میں ریاض کا بھی ذکر بار ہا آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ریاض مرحوم اپنی زندگی کی آخری ساعتیں خیر آباد میں درویشانہ صبر و استقلال کے ساتھ بسر کر رہے تھے اور اپنی زاویہ نشینی کو ترک کرنے کے لئے کسی طرح طیار نہ تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جب حیدر آباد کا ذکر آتا تھا تو ان کے نقل و حرکت کی قوت بالکل جواب دے جاتی تھی، کیونکہ انھیں یہ وہم پیدا ہو گیا تھا کہ جس سرزمین نے داغ و امیر کو ہمیشہ کیلئے اپنے اندر جذب کر لیا، وہ ریاض کے لئے بھی ایسی ہی دامنگیر ثابت ہوگی اور وہ یہ چاہتے نہ تھے کہ سوائے خیر آباد کے کہیں اور سپرد خاک کئے جائیں۔

مہاراجہ بہادر نے کئی بار یہ بھی فرمایا کہ ریاض سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، لیکن میں نے ہر بار یہی عذر پیش کر دیا کہ وہ اب نقل و حرکت سے معذور ہیں (اور واقعی ایک حد تک وہ تھے بھی معذور ہی) اس کے بعد بعض صحبتوں میں کچھ ایسی گفتگو ہوئی جس نے مجھے یہ توجہ دلائی کہ اگر خود ریاض کی طرف سے کوئی عریضہ پیش ہو جائے تو بارگاہ شاد سے کسی مستقل امداد کا جاری ہو جانا ممکن ہے

جب میں لکھنؤ واپس آیا، تو میں نے مرحوم کو ایک خط لکھا کہ وہ ایک درخواست لکھ کر میرے پاس بھیجدیں، چنانچہ انھوں نے اپنے ایک خط کے ساتھ وہ درخواست میرے پاس بھیجدی جو ذیل میں درج ہیں اور جن کے مطالعہ سے ریاض الاخبار اور فتنہ کا وہ دور سامنے آجاتا ہے، جب گورکھپور میں، ریاض کا طوطی بول رہا تھا اور ملک میں کوئی اس کا ہمعصر موجود نہ تھا۔

ریاض کے مایۂ ناز مولانا نیاز - آپ سے جدا ہو کر بیمار ہو گیا پانچ روز کے بعد اجابت کیا ہوئی وضع حمل ہوا۔ قصد تھا خود آپکے پاس لکھنؤ آؤں مگر مجبور ہا۔ اب درخواست ذریعہ ڈاک بھیج رہا ہوں، ایک تو آپکے مسودے کی نقل ہے، دوسری آپکے الفاظ سے مدد لیکر لکھی ہے۔ بہرحال جو آپ پسند فرمائیں اور اگر میری حاضری کی ضرورت ہو تو ایک کارڈ بھیجدیجئے میں فوراً اول ٹرین سے کارڈ ملنے پر آجاؤں گا۔ ستمبر کا نگار تیاری کے قریب ہوگا۔ آپ بھی دکن جانے کو تیار ہونگے۔ مجھسے زیادہ آپ کو میرا خیال ہے۔ گھر میں اور بچوں کو بہت بہت دعا۔

ریاض — ۲ ستمبر سنہ ۳۲ء

بندگان ہمایوں ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ دکن بالقابہ دام اجلالہ واقبالہ

سرکار والا

درویشِ شکستہ ناخن، ریاضِ گوشہ نشیں، دور سے سلام کے لئے خمیدہ سرادب بصد عجز حضور میں پیش کرتا ہے۔

قبول ہو کہ نہ ہو ہم کو سجدہ کرلینا

آہ — پیرانہ سری و پیرانہ سالی میں جب نہ دماغ پر قابو ہے نہ زبان قلم پر اظہار مدعا کے لئے کیا صورت اختیار کروں۔ بارِ علائق کو دیکھ کر پیٹھ نے دُہرا ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ اب نشاط زندگانی و لطف حیات کا سوال نہیں۔ سوال ہے تو نفس کی آمد و شد کا وہ بھی اس طرح

زندگی آٹھ پہر لطف سے کٹتی قاتل سانس کی طرح رواں سینے میں خنجر ہوتا

میں چاہتا ہوں حضور شاد کے در پر، دلِ ناشاد کو بہ صورت خاک اُفتادہ، اپنا سراپا بنا کر، اس شعر کے سانچے میں پیش کروں:-

کچھ اپنے حال کا مجھے احساس ہی نہیں، یہ میں ہوں پیرہن میں کہ مردہ کفن میں ہے

یہ کون ہے وہ ریاض ہے۔ جس کو زمانہ کہہ رہا ہے:-

جانِ سخن ریاض جہانِ سخن میں ہے

یہ کون ہے وہ ریاض جو اسوقت تصور میں سخن شناس سرکار والا کے روبرو یہ شعر پیش کر رہا ہے:-

واعظ نے بزمِ وعظ میں چھلکا ہے جس کے جام وہ نوکشیدہ میں نہ شراب کہن میں ہے،

یہ کون ہے وہ ریاض ہے۔ جسے مسیحا نفس سرکارِ والا نے کبھی اپنے لبِ معجز نما سے "سجع" کے پیرایے میں یہ قبول ہونے والی دعا دی تھی

شاد صاحب کی دُعا ہے ہر دم رہے سرسبز ریاضِ احمد

یہ کون ہے وہی ریاض ہے جو سرکار والا کی دعا سے کہنگی میں بھی نو بہار نخلِ گل کی طرح پھولا پھلا۔ اُسی دعا کے اثر سے پنجاہ سالگی کے بعد بھی متعدد بہاریں دیکھیں اور خزاں کے دور اس کی سرسبزی کو بڑھاتے رہے یہاں تک کہ جب نشاط زندگانی بہ اعتبار زن و فرزند مبدل بہ مایوسی و نامرادی ہو چکی تھی، عروس نوبہار وہ نو دمیدہ نونہال لاتی رہی کہ سرسبز ریاض یہ کہنا بھول گیا:-

میرے اللہ نے دی مجھ کو یہ اولاد سعید میرے اشعار وہ ہیں جن سے مرا نام چلے

سرکار والا، اسی لئے صرف اپنے واسطے آمد و شد کا سوال نہیں رہا بلکہ اُن متعدد افراد کی پرورش و ضروریات زندگانی کا سوال ہے جن کا بار نیرنگ قدرت مجھ پہ ڈال کو ستم ظریفی سے علٰحدہ ہو گئی۔ کہاں قدرت کی

یہ ودیعتِ عظیم، کجا میرے عظامِ رمیم- مگر نیرنگ قدرت کی ستم ظریفی کو ضرور اُس قبول ہونے والی دُعا سے لگاؤ ہے جس پر بصورت سجع اثر کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا-

دعا سے تا اجابت فاصلہ تھا تیر کی زد کا،

کیا سرکار والا اپنے لبِ معجز نما سے اِس مصرع کو جاں بخش تبسم کے ساتھ دُہرانے کی تکلیف میری بازگشت شباب کے لئے گوارا فرما سکتے ہیں

رہے سرسبز ریاض احمد

کیا دُہرانے کی خاموش آواز یا دور کی آواز فردوس گوش بن کر مجھ تک پہونچ سکتی ہے کہ میں دعائے دولت واقبال کے لئے جوانانہ اُمنگ، کے ساتھ چند روز اور زندہ رہ سکوں ورنہ ظاہر ہے

دم واپسیں بر سر راہ ہے　　　عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

فدائی ریاض　- از خیرآباد

افسانہ ہی افسانے

انشائے لطیف :- اُردو ادب میں صاحب "لالہ رخ"، کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل- احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے- ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اُردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے- یہ پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے- آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات، شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعے کو دیکھئے پونے تین سو صفحات- قیمت مجلد دو روپیہ-

نغمات :- اس مجموعہ میں جناب ل- احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے، شامل ہیں، جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے- اُردو کی نفاست و لطافت کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا ازبس ضروری ہے- ۱۳۶ صفحے- قیمت مجلد ایک روپیہ-

زندگی کے کھیل :- ل- احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں- ۱۵۰ صفحات، قیمت مجلد ایک روپیہ-

محبت کا فسانہ :- یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل- احمد صاحب نے مسرت ازدواج سے بحث کی ہے- لیکن اس غایت تصنیف کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسایل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے- ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ-

منیجر "نگار"، لکھنؤ

باب الاستفسار

شیفتہ کی شاعری

(جناب محمد نعیم اللہ صاحب - مبارکپور)

میں نے شیفتہ کے کلام کا بہت کم مطالعہ کیا ہے، لیکن ان کے جتنے اشعار میں نے سنے ہیں ان کو دیکھ کر میں نے ان کی شاعری کے متعلق کوئی اچھی رائے قایم نہیں کی۔ میں ایک سلسلۂ تصنیف میں ان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اگر نامناسب نہ ہو تو تفصیل کے ساتھ مجھے اپنی رائے سے مطلع فرمایئے، تاکہ میں اپنی کتاب میں ان کے متعلق کوئی غلط رائے نہ قایم کرسکوں، گو پھر بھی مجھے اپنی ذاتی رائے پر قایم رہنے کا حق حاصل ہوگا۔ اگر میں آپ کے بیان سے مطمئن نہ ہوا۔

(نگار) میں شاید آپ کے استفسار کا جواب دینے میں اس قدر عجلت سے کام نہ لیتا، اگر آپ یہ نہ ظاہر کردیتے کہ کسی تصنیف میں شیفتہ کا ذکر کیا جارہا ہے۔ چونکہ مجھے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ مبادا آپ کی رائے جو یقیناً غلطی پر مبنی ہے پبلک کو بھی گمراہ کردے، اسلئے میں اولین فرصت میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ شیفتہ کے متعلق آپ نے جو رائے قایم کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ حیرت ہے کہ آپ ایک تصنیف کے سلسلہ میں شیفتہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں اور صرف ان چند اشعار پر اپنی رائے کا حصر کرنا چاہتے ہیں جو اِدھر اُدھر لوگوں سے سن لئے ہیں۔ آپ کا ایک طرف یہ فرمانا کہ "میں نے کلام شیفتہ کا بہت کم مطالعہ کیا ہے" اور دوسری طرف ان کے متعلق ایک بُری رائے قایم کرکے اسے مستقل تصنیف میں جگہ دینا، اس قدر عجیب بات ہے کہ دنیائے تصنیف و تالیف میں شاید ہی کوئی دوسری مثال اس کی مل سکے۔

لوگ برسوں ایک ایک مسئلہ کی چھان بین کرتے ہیں، جب کہیں جاکر وہ کسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں۔ لیکن آپ محض چند سنے سنائے اشعار پر اس قدر اعتماد کرلیتے ہیں کہ کسی مزید کاوش وجستجو کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔

معاف فرمایئے، اگر آپ کی یہ تصنیف تمامتر انھیں خوش ادائیوں کا نتیجہ ہے، تو ڈرتا ہوں کہ معلوم نہیں آپ نے

اور کس کس کو بسمل کیا ہوگا۔ سچ ہے :۔

باچابکانِ دلبر وشوخانِ دلفریب
بسیار درفتادہ و اندک رہیدہ اند

افسوس ہے کہ آپ نے ان اشعار کو تحریر نہیں فرمایا جن کی بنا پر آپ نے شیفتہ کے متعلق بُری رائے قایم کی ہو ورنہ مجھے آپ کا ذوق سمجھنے میں کافی مدد ملتی، لیکن چونکہ شیفتہ کے وہی اشعار زیادہ مشہور ہیں جو واقعی نہایت اچھے ہیں اس لئے بتکلف برطرف، میں آپ کے ذوق اور آپ کی تصنیف دونوں کی طرف سے سخت مایوس ہوں۔

شیفتہ کے چند مشہور اشعار یہ ہیں اور غالباً آپ نے بھی انھیں کو سنا ہوگا :۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی،

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا،
قاصد وہ بہت الم کریں گے

ہائے وہ شیفتہ کی بیتابی
تھام لینا وہ تیری محمل کو

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین،
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

فارسی کے اشعار میں اس لئے نہیں لکھتا کہ آپ نے غالباً انھیں سنا بھی نہ ہوگا، اور اگر سنا ہوگا تو سمجھنے کی کوشش نہ کی ہوگی۔

ہر چند آپ نے میری رائے پر عمل کرنے کا وعدہ نہیں کیا ہے، تاہم مجھے اس کے ظاہر کر دینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ شیفتہ اپنے زمانہ کے بہترین شعراء میں شمار کیا جاتا تھا اور یہ رائے نہ میری ہے نہ مجھ جیسے کسی اور نااہل کی بلکہ ان کی جنکی شاعری کے غالباً آپ بھی معترف ہوں گے، یعنی غالب و مومن۔

غالب کہتا ہے :۔

غالب، ز حسرتی چہ سراید کہ در غزل
چوں او تلاش معنی و مضموں نہ کردہ کس

آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ شیفتہ، فارسی میں حسرتی تخلص کیا کرتے تھے اور انھیں کے متعلق غالب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

ایک اور جگہ غالب یوں لکھتے ہیں :-

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

مصطفٰے خاں، شیفتہ ہی کا نام تھا اور انھیں کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے۔

اپنے ایک قصیدہ میں غالب ان کا ذکر اس طرح کرتا ہے :-

آں ہمائے تیز پروازم کہ بال
در ہوائے مصطفٰے خاں میزنم

عرفی و خاقانیش فرماں پذیر
سکہ در شیراز و شرواں میزنم

سبد چین میں بھی میرزا نے ان کا ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو :-

مصطفٰے خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من ست
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ من ست

ممکن ہے آپ یہ فرمائیں کہ شیفتہ چونکہ نواب تھے اس لئے ان کی خوشامد کی گئی ہے۔ بیشک غالب کے متعلق آپ یہ کہہ سکتے ہیں، لیکن مومن کو آپ کیا کہیں گے جو کسی کی خوشامد کرنا جانتا ہی نہ تھا، اس نے بھی شیفتہ کے ذوق کی داد اس طرح دی ہے :-

ز تحسینِ او حسنِ معنی نیاز
ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

اگر آپ نے کلیاتِ مومن دیکھا ہوگا تو اس میں ایک معمہ نواب مصطفٰے خاں بہادر کے نام کا بھی ملاحظہ سے گزرا ہوگا جس کا پہلا شعر یہ ہے :-

نوا بلبل کی بے بس کر رہی ہے
بہار اک جام بیجا بھر رہی ہے

شیفتہ جس انجمن کے چشم و چراغ تھے اس کے بعض افراد کے نام آپ بھی سن لیجئے :-

— نواب ضیاء الدین خاں نیّر — مفتی صدر الدین آزردہ — حکیم احسن اللہ خاں —
امام بخش صہبائی — میرزا اسد اللہ خاں غالب — حکیم مومن خاں مومن —
میر حسین تسکین — غلام علی خاں وحشت۔

انھیں لوگوں کے ساتھ شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا اور ان میں سے ہر ایک فرداً فرداً، شیفتہ کے ذوق سخن کا شیفتہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو غزل گوئی اپنے شباب پر تھی، صنایع لفظی متروک ہو کر لطیف فارسی تراکیب کی آمیزش سے حسنِ معنی کی ایک نئی راہ شاعری میں پیدا ہو گئی تھی اور صفائی و سلاست نے نہایت دلکش اسلوب اختیار کر لیا تھا۔

اسی زمانہ میں شیفتہ نے شاعری کی اور اس آن بان کے ساتھ کہ سبھی کو اُس کا اعتراف کرنا پڑا، اور آج بھی ہر صاحب ذوق اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

انھوں نے سب سے پہلے مومن کا تلمذ اختیار کیا اور اس کے بعد غالب کا، لیکن سچ یہ ہے کہ خود فطرت نے انھیں شاعر پیدا کیا تھا، اور اگر ان میں سے کسی کا تلمذ حاصل نہ ہوتا تو بھی وہ اسی مرتبہ کی شاعری کرتے۔

آپ نے غالب کی وہ مشہور غزل سُنی ہوگی جس کا ایک شعر یہ ہے:-

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اسی زمین میں شیفتہ کے بھی دو شعر سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ کیا چیز ہیں:-

ناشکیبی کی دعا مانگیں گے، — صبر کی ہم کو ضرورت ہی سہی
اژدہامِ غم و رشک و حرماں، — پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

اور مقطع تو ایسا لکھ گئے ہیں کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا، ملاحظہ ہو:-

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں — خیر، اُن سے تمھیں نفرت ہی سہی

مومن کے مشکل رنگ کو بھی انھوں نے کمال حسن و خوبی کے ساتھ نباہا، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

یار کو محرمِ تماشا کیا — مرگِ مفاجات نے یہ کیا کیا،
عرضِ تمنا سے رہا بیقرار — شب وہ مجھے، میں اسے چھیڑا کیا
غیر ہی کو چاہے ہیں اب شیفتہ — کچھ تو ہے جو یار نے ایسا کیا،

کل نغمہ گر جو مطرب جادو ترانہ تھا — ہوش و حواس عقل و خرد کا پتہ نہ تھا
دشمن کے فعل کی تمھیں توجیہ کیا ضرور — تم سے فقط مجھے گلۂ دوستانہ تھا
کل شیفتہ سحر کو عجب حالِ خوش میں تھے — آنکھوں میں نشہ اور لبوں پر ترانہ تھا

ان کے یہاں اور اساتذہ کا رنگ بھی پایا جاتا ہے، مثلاً مصحفی

اس نو بہارِ حُسن کو بدنام مت کرو — تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں
ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کاہے کو تھا — شیفتہ اُس کو تو تم سے محبت نکلی،
کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں — کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں
اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی — کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز
وہ مجھ سے خفا ہے تو اُسے یہ بھی ہے زیبا — پر شیفتہ میں اس سے خفا ہو نہیں سکتا

انھوں نے میر سے بھی استفادہ کیا، مثلاً:۔

اے ستمگر رگِ جاں میں ہے مرے پیوستہ
دم نکل جائے گا سینہ سے مرے تیر نہ کھینچ[1]

کہتے ہیں علاج آپ کریں کچھ خفقان کا
دل کا ہے کو رہویگا سنائی اگر ایسی

لیکن ان کا طبعی رنگ وہی تھا جس پر مومن و غالب کی شہرت قایم ہوئی، ملاحظہ ہو:۔

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم،

دامن تک اسکے ہائے نہ پہونچا کبھی وہ ہاتھ
جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا

رنگیں ہے بیگناہوں کے خوں سے سوادِ شہر
حالانکہ واں ہنوز سرِ امتحاں نہیں

وجد کو زمزمۂ مرغِ سحر کافی ہے
شیفتہ نازِ مغنی و مزامیر نہ کھینچ

قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو
دیکھا وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں

معلوم نہیں شیفتہ کی فارسی شاعری کے متعلق آپ کچھ سننا پسند کریں گے یا نہیں، لیکن خیر اب ذکر آگیا ہے تو اُسے بھی "بادلِ ناخواہ" سُن لیجئے۔

شیفتہ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے اور اتنا اچھا کہتے تھے کہ اگر آپ غالب و نظیری کے کلام کے ساتھ ان کے اشعار ملا دیجئے تو مطلق تمیز نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے غالب، نظیری و حافظ کی طرحوں پر بہت سی غزلیں کہی ہیں اور انھیں خصوصیات کے ساتھ جو اُسوقت کے معیاری فارسی تغزل میں پائی جاتی تھیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشان ست
کسے نہ داد تسلی دلِ زلیخا را

خندہ چہ خوش شیوہ ایست از پسِ خشم و عتاب
لذتِ دیگر دہد زخمِ نمک سود را

رحم ست بر کسے کہ دراں کوئے می رود
در دست نامۂ من و بر لب سلامِ ما

در چارۂ او کوش کہ دیوانہ انت امروز
از نکہتِ گُل بوئے ترا باز ندانست

براں سرم کہ ز ہر نیک و بد کنارہ کنم
خورم شراب و رخِ نیکواں نظارہ کنم

زبان کے لحاظ سے اُن کے کلام کی ایرانیت ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے:۔

نہ چو عشق سازگارم بہ مزاجِ دردمنداں
نہ چو حسن اعتبارم بہ نگاہِ خود پسنداں

برخِ چو آفتابت نگہ قمر عذاراں
بکمندِ عنبرینت سرِ عنبریں کمنداں

---

[1] میر کا شعر ہے:۔

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینہ سے لیکن جاں سمیت

شب وصل غیر رفتم پئے التساب نفرت | چو ہجوم عیش دیدم شدہ شوقِ من دوچنداں
زچہ حسرتی ننالم زجفائے طالعِ بد | بمذاقِ یار تلخم چو فغانِ دردمنداں

انھوں نے فارسی قصاید بھی لکھے ہیں اور سب اس رنگ کے جن پر عرفی کا دھوکا ہوتا ہے اور فارسی رقعات میں تو بالکل غالب نظر آتے ہیں، اور ایسے ایسے پاکیزہ اشعار صرف کئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حسرتی کے ذوقِ سخن پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔

بہرحال میری رائے میں شیفتہ اپنے زمانہ کا نہایت اچھا شاعر تھا اور یہ ممکن نہیں کہ مومن و غالب کے ذکر کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک ایسا نہیں ہے تو اس باب میں آپ کا خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

دم مزن از رہ کہ مرد رہ نئی !

جنوری ۴۰ء کا "نگار"

نظیر نمبر

زیر ترتیب ہے اور کتابت شروع ہو گئی ہے، جن صاحب نے اب تک اپنے موعودہ مقالے ارسال نہیں کئے، وہ براہ کرم جلد توجہ فرمائیں زیادہ سے زیادہ ۲۵ نومبر تک مضامین دفتر میں پہونچ جانا چاہئے۔

منیجر نگار لکھنؤ

ایجنٹوں کو معلوم ہونا چاہئے

کہ نظیر نمبر، بھی سابقہ خاص نمبروں کی طرح پھر کسی قیمت پر نہ مل سکے گا، اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ جتنے پرچے طلب کریں گے اتنا ہی زیادہ فایدہ ان کو ہوگا

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

کمیشن ۲۵ فی صدی، مصارف ڈاک ہمارے ذمے ہوں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

غزل:

حواس وہوش کی دنیا پہ چھا گیا کوئی
نفس نفس کو مرے جگمگا گیا کوئی

کسی کی مست نگاہیں ارے معاذاللہ
خرابِ بادۂ اُلفت بنا گیا کوئی

جنوں نواز نگاہوں سے دیکھ کر مجھ کو
تباہ حال کی دُنیا بنا گیا کوئی

کہا جو میں نے یہ سب کچھ کرم تمھارا ہے
تو مُسکرا کے نگاہیں چرُا گیا کوئی

بڑھیں جو حد سے مری وحشتیں تو گھبرا کر
تھپک تھپک کے مجھے خود سُلا گیا کوئی

یہ چاہتا ہوں کہ اب اُس کو بھول جاؤں مگر
الٰہی خیر کہ پھر یاد آگیا کوئی

شبِ وصال، غمِ انفراق، اے راحت
فنائے زیست کا حاصل بتا گیا کوئی

(نوابزادہ) راحت سعید خاں بی۔اے

بازگشت

عارض پہ پسینے کے قطرے وہ بھیگا ہوا شبنم میں گلاب
مست آنکھوں میں وہ آنسو جیسے ساغر سے چھلکنے کو ہو شراب

کچھ کھویا کھویا سا عالم کچھ بھیگی بھیگی سی پلکیں،
کچھ اُترا اُترا سا چہرہ کچھ بکھری بکھری سی زلفیں

وہ اپنے آپ مچل جانا پھر سوچ کے خود چپ ہو جانا
اک سمت نگاہ جما دینا اور بیٹھے بیٹھے کھو جانا

گھبرائی ہوئی سی وہ نظریں کچھ جیسے چھپانے کی کوشش
دانتوں میں دبا کر ہونٹوں کو آنسو پی جانے کی کوشش

عشاق کے ارمانوں کی طرح وہ بل کھا کھا کر رہ جانا
جب دل پہ کوئی بس نہ چلے ہونٹوں کو چبا کر رہ جانا

وہ آرزوؤں میں لپٹی ہوئی صد شعلہ بجاں ٹھنڈی سانسیں
ماتھے پہ شکن ابروؤں میں بل اور دلمیں محبت کی پھانسیں

واں حُسن کے تیور بگڑے ہوئے یاں عشق کی حالت ٹلی ہوئی
اک آگ کے دو شعلے لیکن دونوں کی صورت بدلی ہوئی

طوفانِ غلط فہمی برپا حُسن اور محبت میں باہم
تمکینِ نظامِ مہر و وفا ہونے ہی کو تھا درہم برہم

اکبار جو آنکھیں چار ہوئیں نظروں میں تکلم آ ہی گیا
پھر لاکھ بنائے کچھ نہ بنی ہونٹوں پہ تبسم آ ہی گیا

سرمست تمکین

مسائلِ لطیف

کیفِ تخئیل میں گم رقصِ کناں جاتا ہے،
کس کو فرصت ہے یہ سوچے کہ کہاں جاتا ہے

زندگی کیفِ مسلسل ہے، وہ غم ہو کہ خوشی
راہرو بے خبرِ سود و زیاں جاتا ہے

شرحِ یک قطرۂ شبنم کے لئے بھی ساقی
مانگنے مہرِ درخشاں کی زباں جاتا ہے.

کس حسیں زُلف نے بھیجا ہے مہکنے کا پیام
کس طرف قافلۂ بوئے جناں جاتا ہے

ہے جنوں بھی مگر عرفان کی اک منزلِ خاص
جانے! دل کس کے تجسس میں کہاں جاتا ہے

میکدہ، شرحِ بہ ایجاز ہے اُس جلوے کی،
کعبہ اُس سمت بہ تاویلِ گراں جاتا ہے

ہے تصوُّف بھی خرابات کی چھوٹی سی صفت
راستہ یہ بھی سوئے بزمِ مغاں جاتا ہے

موج ٹکرا کے کنارے سے سکوں یاب نہیں،
یہ جنوں وہ ہے، گراں تا بہ گراں جاتا ہے

دیکھنا جاتے ہوئے ساقیِ مہوش کو عدم
گویا ساتھ اپنے لئے کون و مکاں جاتا ہے

عدم

دیوانے

کیا دشت نوردی میں مصروف ہیں دیوانے
کچھ حسن کے سودائی، کچھ عشق کے پروانے

کھوئے ہوئے وحشت میں ڈوبے ہوئے اُلفت میں
حالات سے ناواقف، ماحول سے بیگانے

اُمڈے ہوئے آنکھوں میں اسرارِ جہاں بینی
گوندھے ہوئے نظروں میں کونین کے افسانے

اللہ رے وحشت کا اندازِ خود آرائی،
صد چاک گریباں پر ہنستی ہوئی رُسوائی

گفتار کی لہروں میں اسرار کی طغیانی
رفتار کی موجوں میں طوفان کی برنائی

وحشت کی روش میں بھی کچھ خاص مطالب سے
اندازِ جنوں میں بھی ادراک کی رعنائی

کشتی کی طرح پیہم کھاتی ہوئی ہچکولے
آہوں کے تلاطم میں آفاق کی پہنائی

اسرارِ محبت کی آواز ہیں دیوانے
میخانۂ فطرت کے ہمراز ہیں دیوانے

باقیؔ صدیقی

غزل :-

چمن در انتظار ہے کلی کلی گلاب کی،
بہار آکے کھول دے گرہ ذرا نقاب کی

بلند ایک شاخ پر، یہ کہہ رہا ہے تن کے گل
مصوری میں کر رہا ہوں حسن کے شباب کی

سفینہ ہے یہ زندگی، ہوائے تیز ہر نفس
حزین و بے قرار دل ہے موج اضطراب کی

اُٹھا ہے فتنۂ سحر، تجھیں نے خواب بے خبر
نگاہ بن کے پڑ رہی ہے دھوپ آفتاب کی

کہے پیام دل کا کوئی اُن سے وہ جہاں بھی ہوں
بہ قدرِ تابِ دید ہے گل آبرو و حجاب کی

درِ حرم پہ سر مرا دماغ آسمان پر
بہشت! تیری آرزو نے عاقبت خراب کی

بڑھے ہیں وہ رواں دواں، مگر ذرا خبر نہیں
شباب! اُف شباب ہے کہ موج ہے شراب کی

نگاہ میں وہ شوق کی، کرم ہے تابِ دید کا
جبیں پہ بل پڑا ہوا، نظر ہے یہ عتاب کی

کلیم اور مجھ میں فرق ہے یہ کیفیؔ حزیں
اُدھر سوالِ ہوش تھا، غشی اِدھر جواب کی

(مولانا) کیفیؔ چریاکوٹی

غزل:

اک "کیفِ مستقل" میں بسر زندگی ہوئی، / ہر سانس میں بھی یاد کسی کی بسی ہوئی
ہاں رہ نوردِ عشق، ذرا دیکھ بھال کر / غافل یہیں کہیں ہے قیامت چھپی ہوئی
شاید یہیں ملی ہیں حدیں حسن و عشق کی / ہر چیز پر ہے مہرِ خموشی لگی ہوئی،
ہر چند دار و طور بھی ہیں مرکزِ جمال / لیکن مری نظر ہے تجھی پر جمی ہوئی
برہم زنِ کون و مکاں دیکھنا کلیم / جس دن بھڑک اُٹھی مرے دل کی دبی ہوئی
کروٹ کے ساتھ ساتھ زمانہ بدل گیا / اک آہ میں تمام "شبِ زندگی" ہوئی

کیسا حساب اور کہاں کی سزا بہار
کمبخت آئے گی نہ جوانی گئی ہوئی

بہار - کوٹی

غزل:

بہار آئی ہے پھر خاکِ چمن گلریز ہے ساقی / اُٹھا ساغر کہ دنیا آج عنبر بیز ہے ساقی
نہ جانے کتنے دل خوں کر دئے تیری نگاہوں نے / تبسم ہے ترا یا خنجرِ خوں ریز ہے ساقی
ترے صدقے ترے قرباں پلائے جا پلائے جا! / مری ہر سانس اب اک موجِ آتش ریز ہے ساقی
مجھے اندیشۂ افلاک کیوں ہو خوفِ فردا کیوں؟ / ابھی تو تیرے پیمانے میں تند و تیز ہے ساقی
نہ دے صہبا، مجھے دردِ تہِ ساغر ہی کافی ہے / مئے گلگوں کا ہر قطرہ نشاط انگیز ہے ساقی

گدائے حسن ہے کاوش مگر وہ اس پہ نازاں ہے
کہ تیری ٹھوکروں میں دولتِ پرویز ہے ساقی

کاوش حیدرآبادی

گلِ مزار

جھٹ پٹے کا وقت ہے، ٹوٹی ہوئی قبر کے سرہانے چھوٹے سے خزاں رسیدہ پودے کی ٹہنی میں ایک ننھا سا زرد رنگ کا پھول کھلا ہوا ہے، قبرستان کے چٹیل میدان کی ہوائیں، اس پھول کو جھولا جھلا رہی ہیں، کبھی پینگ بڑھ جاتی ہے کبھی گھٹ جاتی ہے، مگر پھول سب سے بے پروا کسی کی تلاش میں سرگرم ہے، اور قطرۂ شبنم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

پھول:-

رنگ الگ لوٹا گیا، چھینی گئی خوشبو الگ
خاک ایسی زندگی پر، میں الگ اور تم الگ

قطرۂ شبنم یہ سنکر پھول کی پنکھڑی پر ٹپک پڑتا ہے اور آفتاب آہستہ آہستہ سر نکالکر کہتا ہے:

آفتاب:-

ہوں سمندر زندگی کا، نور کا ہوں آبشار
لوٹتی ہیں میری کرنیں باغِ دنیا کی بہار

خون سے میرے یہاں کے ذرہ ذرہ میں نمو
دہر میں ہر چیز کو رہتی ہے میری آرزو

بخشتا ہوں لعل، پتھر کو سمندر کو گہر
پھول پھل اشجار کو، حیوان و انساں کو نظر

روشنیِ بزمِ عالم، میں نہیں تو اور کون؟
بادشاہِ روحِ آدم میں نہیں تو اور کون؟

قطرۂ شبنم:-

میں کسی کی منتظر آنکھوں سے ہوں ٹپکا ہوا
آرہا ہوں آسمانِ عشق سے لپکا ہوا

اس گلِ بے رنگ و بو کی دیکھ کر تنہائیاں
میں سکھانا چاہتا ہوں اس کو بزم آرائیاں

چاہتا ہوں آپ گم ہوں، پھول کو زندہ کروں
شہرِ خاموشاں میں روشن شمع رخشندہ کروں

آفتاب:-

پھول ہی باقی رہے گا اور نہ تیری آب و تاب
رہتی دنیا تک رہوں گا صرف اک میں "آفتاب"

قطرۂ شبنم کے دل کو ٹھیس لگتی ہے لیکن مسکراتا ہوا کہتا ہے:

قطرۂ شبنم:- تو خودی کا سحر ہے میں بے خودی کا معجزہ
تو فسونِ ہوش ہے میں بیہشی کا معجزہ

یعنی میں ہوں بے جہت اور تو بہت محدود ہے　　میں ہوں بے مقصود، تو زندانیِ مقصود ہے
بے نیازِ راہ ہوں میں تو ہے جادہ کا غلام،　　میں فنائے مستقل اور تو حیاتِ ناتمام

(آفتاب توہین آمیز تبسم سے دیکھتا ہے اور قطرۂ شبنم اس میں جذب ہو کر فنا ہو جاتا ہے)

(تھوڑی دیر خاموشی)

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، ایک شاعر داخل ہوتا ہے، اور قبر کے سرہانے ایک پھول دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے)

شاعر:۔

اے گُلِ نو تجھ پہ ہے افسردگی چھائی ہوئی　　تیری نکہت بھی نظر آتی ہے گھبرائی ہوئی،
کاٹ دے ہنس کھیل کر تو اپنی عمرِ مختصر　　کاروبارِ اہلِ عالم پر ہے کیوں تیری نظر

پھول:۔

ہے لبِ گور اپنی پیدائش کے دن اے زندگی　　ابتدا ہی سے ہے افسردہ مری تابندگی
میری شمعِ رنگ کا پروانہ کوئی بھی نہیں　　پھیلنی خوشبو کا مری مستانہ کوئی بھی نہیں
شب کو پتھر قبر کے جل کر جلاتے ہیں مجھے　　دن میں ذرے خاک کے آنکھیں دکھاتے ہیں مجھے
ہمنشیں اک قطرۂ شبنم تھا دم بھر کو ملا،　　وہ بھی بدبختی سے میرے نذرِ نخوت ہو گیا
چاہتا ہوں چند لمحے عیش میں کیجے بسر　　تو ہی مجھ کو اپنے سینے سے لگا لے توڑ کر

شاعر:۔

داستاں سنکر تری دل ہے میرا خوننابہ بار　　لالہ زارِ زندگی ہے درحقیقت خارزار
میں بھی دل کا قافلہ لٹوا کے آیا ہوں یہاں　　کر چکی ہیں خاک مجھ کو عشق کی چنگاریاں
یوں سمجھ لے بس کہ اک پامالِ نقشِ جادہ ہوں　　یعنی تجھ سے بھی زیادہ میں فنا آمادہ ہوں،

پھول، بس سنتے ہی یہ، شاعر کے سینہ پر گرا　　اور شاعر بھی نہ اس صدمہ سے جانبر ہو سکا

عرش تیموری

ایک غلطی کی تصحیح

پچھلے پرچہ میں صفحہ ۵۹ پر یہ شعر غالبؔ سے منسوب کیا گیا ہے:۔

یادم نمی کنی و زیادم نمی روی　　عمرت دراز باد فراموشکارِ من،

یہ شعر کلیاتِ غالبؔ میں تو ہے لیکن غالبؔ کا نہیں ہے شاید خسروؔ یا کسی اور شاعر کا ہو جسے غالبؔ نے بطور حوالہ نقل کیا ہے۔　نیاز

غزل:

رکی جاتی ہے شرح رازِ دل پر اب زباں میری
نگاہِ بیخبر یہ آخری ہیں ہچکیاں میری

ہوئی جاتی ہے افسردہ کسی کی محفلِ عشرت
بدل دے اے نیازِ عشق تاثیر بیاں میری

جدا ہوں بزم سے لیکن نظر میں ہے وہی عالم
تجھے بھولی نہیں ہیں آجتک بیتابیاں میری

خموشی میں بھی رازِ عشق اے ہمدم نہیں چھپتا
کہ تشریحِ غمِ پنہاں ہے چشمِ خونفشاں میری

سمجھ میں کچھ نہیں آتا مآلِ کار کیا ہو گا
دمِ عرضِ تمنا آج رُکتی ہے زباں میری

کسی کے سنگ در پر چند سجدے اور کر لیتا
اجازت مجھکو دیدیتی اگر عمرِ رواں میری

خدا کا شکر ہے میں بے نیاز جلوۂ گل ہوں
اسیری پر فدا ہیں اے جنوں آزادیاں میری

ہر آہِ سرد میں مضمر ہے سوز و ساز کی دُنیا
توجہ سے کبھی تو آپ سنئے داستاں میری

ہر اک فقرہ میں اے خیرات لاکھوں رمز پنہاں ہیں
مرقع ہے غم و درد و الم کا داستاں میری

(جناب) خیرات تاندوری

جذباتِ تہنیت

یہ نظم حضرت امید امیٹھوی کی ہے۔ جو جناب آذری فرید آبادی کے سفر ولایت سے واپس آنے کی مسرت میں لکھی گئی ہے اور خوب ہے

اے نورِ اہلِ بینش و اے سیدِ انوری　　زیبد ز عیدِ خویش دہم گر نویدِ عید
بر بوئے دیدِ تست چو نظارگانِ ما　　بستیم چشمِ شوق بماہِ سعیدِ عید
قفلے کہ روزہ بر درِ عیدم نہادہ بود　　دادند از ہلال بدستم کلیدِ عید
در ہر جدید گرچہ بود لذتِ جدید　　اما مپرس لذتِ عیدِ جدیدِ عید
اے غائب از دو دیدہ و اے ہمنشینِ دل　　تو عیدِ روے، ائی و دیدِ تو عیدِ عید
از خانہ ہمچو آئینہ بیروں نمیروی　　گرچہ جوابِ دید بود باز دیدِ عید
یک جلوۂ تو حاصلِ سی روزۂ منست　　دیگر مرا چہ کار ز گفت و شنیدِ عید
نازم بدیں کہ بندۂ بے دانتم و لے　　حاشا نیم غلامِ غم زر خریدِ عید
کاش از تلطفے بدہی مژدۂ وصال　　کاج از تفقدے بفرستی بریدِ عید
اے روئے غم سیاہ کہ در روزِ عید ہم　　بد قسمتم ز دیدنِ روئے سپیدِ عید
در انتظارِ وعدۂ عیدت وعید شد　　اُمید کس مباد چو من نا اُمیدِ عید

باز آمدم ز شکوہ و دیگر بشوق دید
آوردہ ام بہ نذرِ تو دُرِّ فریدِ عید

در مبحثِ تقدمِ دید تو ہمدگر　　در جنگ آمدند دو طفلِ عنیدِ عید
طغیانِ رشک بیں کہ تو گوئی بُریدہ شد　　حبل الوریدِ عید ز تیغِ حدیدِ عید
اے وہ چہ ملت ست کہ اے سروِ نازِ من،　　در مذہبت ہدر شدہ خونِ شہیدِ عید
منکر مشو ز معجزِ سحرِ حلالِ من　　اے مصحفِ رُخ تو کلامِ مجیدِ عید
گوئی کہ از بیاضِ سویدا سوادِ من　　وام ست روشنائی بصبحِ امیدِ عید
شایانِ شان قافیہ حرفے کہ رُو نمود،　　پیوند کردمش بہ ردیفِ مفیدِ عید
نازد عطارد ار بفلک بر نگارشم،　　آید برقص زہرہ ز لحنِ نشیدِ عید
چوں برگِ گل پرد رقم در ہوائے شوق　　کلکم دود بصفحہ ز تابِ نبیدِ عید
زیں عرضِ شوق عرضِ عقیدت بود مراد　　نے استفادتِ زرِ سُرخ و سپیدِ عید
چندانکہ شوقِ دید شود بر مزیدِ شوق　　بادا مزیدِ عید ترا بر مزیدِ عید
اے در نصیبِ خصمِ تو دار البوارِ غم　　وے بارگاہِ عیشِ تو قصرِ مشیدِ عید

چشمِ بدِ زمانہ زعیدت بود بعید
عمرت دراز باد چو طولِ اُمیدِ عید

(ابوالکمال) امید امیٹھوی